اندھیرے اجالے

مصنفہ
حسن جبین شکیل

ترتیب و پیشکش
ڈاکٹر قنبر علی

نزہت میں تو سمجھتا تھا کہ تم لطیف جذبوں سے آشنا ہی نہیں۔ محبت کے تقاضے کیا ہیں، ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ ان سے تم بالکل لاعلم ہو لیکن ——— لیکن نہیں۔ جب تم مکمل ماں بن سکتی ہو تو بیوی کیوں نہیں ۔ ماں کی محبت کی لطافتوں ، سارے تقاضوں سے تم آشنا ہو۔ پھر شوہر کی محبت کے تقاضوں سے تم انجان کیوں بنی رہیں؟

عورت کی محبت تو ایک درخت کے مانند ہے۔ جس کی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں۔ ہر شاخ اپنے مرکز سے حیات کی تابندگی پاتی ہیں۔ میں نے سمجھا تھا کہ تم اس تابندگی کو بخشنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ یہ میری بھول تھی۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی شاخ اس سوت سے جلا پائے اور کوئی سوکھ جائے ——— نہیں نزہت ! تم جان کر انجان بن گئیں ———

(افسانہ ''شیشہ تہہ سنگ'' سے اقتباس)

اندھیرے اجالے

مصنف
ڈاکٹر حُسن جبیں شکیل
لکچرر
ایس. ایم. کالج بھاگلپور

ترتیب و پیش کش : ڈاکٹر قنبر علی

اس کتاب کی اشاعت میں راج بھاشا، بہار کا مالی تعاون شامل ہے۔ کتاب میں شائع مشمولات یا کسی قابلِ اعتراض مواد کے لئے راج بھاشا، بہار ذمہ دار نہیں

نام کتاب : اندھیرے اجالے

ترتیب و پیشکش : ڈاکٹر قنبر علی

سال اشاعت : ۲۰۱۶ء

صفحات : ۱۵۲

تعداد : ۵۰۰

کمپوزنگ : منعمی کمپیوٹر، احمد مارکیٹ، دریاپور، پٹنہ-۴

مطبع : صائمہ پبلیکیشن، دریاپور، پٹنہ-۴

قیمت : 200 روپے

ملنے کے پتے :

☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴

☆ صائمہ پبلیکیشن، دریاپور، پٹنہ-۴

☆ حسن جبیں شکیل، اہلیہ معروف خاں

بھیکن پور گمٹی نمبر-۳، بھاگلپور-۸۱۲۰۰۱

ANDHERE UJAALE

Writer.

Dr. Husne Jabeen Shakil

Lecturer

S.M. College, Bhagalpur

Price : 200 Rs.

فہرست

والد مرحوم محمد شکیل اور والدہ مرحومہ قمر النساء

کے

نام

جن کی شفقتوں کے سائے میں شعور کی منزلوں کو طے کیا

رگ فسوں کا لہو

یہ بات بالکل درست ہے کہ قارئین کا حافظہ خاصا کمزور ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے چند افسانوں کے ساتھ میں قارئین سے ایک بار پھر روبرو ہونے کی کاوش کر رہی ہوں۔ میرے خیال میں ادب اور غیر ادب میں یہی بنیادی فرق ہے کہ ادب کبھی بے معنی نہیں ہوتا۔ نظروں سے اوجھل ہو سکتا ہے۔

میرے افسانوں کے مجموعہ "اندھیرے اجالے" میں تمام تر تخلیقات قارئین سے داد و تحسین وصول کر چکی ہیں اور مجھے اپنے افسانوں پر اعتبار و اطمینان بھی ہے۔

کہانیاں تو روز و شب کا حصہ رہیں۔ جب گھر کی بڑی بوڑھیاں زندگی سے روشناس کرانے کے لئے ہمیں کہانیاں سناتی تھیں۔ ہمارے گھر میں زبان و ادب سے دلچسپی رہی ہے۔

جریدے بھی آتے رہتے تھے۔ بالخصوص خواتین کے پرچے پابندی سے آتے اور شوق سے پڑھے جاتے۔

کہانیاں لکھنے کا آغاز بہت چھوٹی عمر سے ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ انہیں شائع کرانے کا شوق بعد میں پیدا ہوا۔ میرا پہلا افسانہ ''فرار'' کے نام سے شائع ہوا۔ میرے ماموں جان نعمان احمد خاں میری ادبی صلاحیتوں کو بہت سراہتے تھے اور ہمیں ان کی باتوں سے جس قدر انبساط حاصل ہوتا اس سے زیادہ حوصلے بھی ملتے۔

مجھے بچپن سے دیوانگی کی حد تک پڑھنے کا شوق تھا۔ نئی کتابیں نہیں ملتیں تو پڑھی ہوئی کتابیں دو دو تین تین بار پڑھتی۔ نہیں کچھ ہوتا تو سودے سُلف کے پرزے کو ہی پڑھتی۔

مشترکہ خاندان کے بھرے پرے ماحول میں ہر نشیب و فراز پر نگاہ جاتی تھی۔ بالخصوص خواتین اور ہم لڑکیوں کے مابین جو تبادلۂ خیال ہوتا اس پر نگاہ رہتی تھی۔ شروع سے ذہن بے حد حساس رہا ہے۔ ہر وہ بات جو ناپسند ہوتی دل ہیں چبھ جاتی۔ کبھی کبھی اپنی رائے نہیں دے سکتی تو دل میں بھنور سا اٹھتا رہتا۔ کسی کی جسمانی اور ذہنی تکلیف سے اتنا متاثر ہوتی، اتنا سوچتی کہ محسوس ہوتا، وہ تکلیف مجھے ہی ہو رہی ہے۔

جب میں بہت چھوٹی تھی عورتوں کو ایسی باتیں کرتے سنتی جس میں بیٹوں کی برتری بیٹیوں پر ظاہر ہوتی۔ بیٹوں کے لئے ''نام لیوا''، ''مزار پر چراغ جلانے والا''، ''نسل کو آگے بڑھانے والا'' جیسی باتیں دل کو تکلیف پہنچاتیں۔ میری خالہ امی کو دو خوبصورت بیٹیوں کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا رنگ بے حد سیاہی مائل تھا۔ جو خاتون ہمارے یہاں آتیں برمحل کہتیں کہ کیا ہوا۔ ''کوڑی کانی ہے تو بھی بھلی''۔ بہت دنوں تک تو کانی کوڑی کا معاملہ سمجھ میں نہ آیا۔ بہت دنوں بعد یہ معاملہ کھلا کہ لڑکا بدصورت بھی ہے تو لڑکیوں سے افضل ہے۔ یہ جان کر بڑا تعجب ہوا۔ دل میں لگتا کہ کسی نے سوئی چبھو کر توڑ دی۔

غرض میرے افسانوں میں ان چھوٹی بڑی تفریق کا بڑا اثر ہے۔ میرے افسانوں میں

عورتوں کے کمزور پہلوؤں کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ عورت تو کمزور ہے۔ جسمانی طور پر خدا نے اسے کمزور بنایا ہے، لیکن ذہنی طور پر وہ کسی حال میں مردوں سے کم نہیں۔ یہ سماجی تفریق ہے جس نے اس فرسودہ نظریے کو جنم دیا ہے۔

میں نے اپنے افسانوں میں ان نشیب وفراز کو اندھیرے اجالے کے تناسب سے اجاگر کرنے کی جستجو کی ہے۔ عنوانات بدلتے بھی رہتے۔ لیکن سماجی سروکار کے سرنامے آج بھی اسی شدت سے ادیبوں کے لئے موضوع گفتگو ہیں۔ ہاں ہر ایک کا الگ الگ زاویہ نگاہ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ وقت کے تناظر میں باتوں کو پرکھنے کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔

میں نے جب لکھنا شروع کیا تو فکشن کی سرکردہ خواتین فن کاروں میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، واجدہ تبسم اور جمیلہ ہاشمی وغیرہ کا ستارہ عروج پر تھا۔ قارئین کو ان فن کاروں کی تحریروں کا انتظار رہتا۔ ایسے میں کسی کے لئے اپنی جگہ بنانا آسان نہ تھا۔ میں نے کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے تو اپنے انداز میں اپنی بات کہنے کا ہنر ہی عزیز تھا۔ جدیدیت سے منسلک، ادب کو معمہ بنانے والوں کے غلغلے کا جب وقت تھا تو لکھنے اور چھپنے کا سلسلہ ایک حد تک منقطع رہا۔ اب جب کہ اپنے افسانوں کو دوبارہ پڑھا تو دل میں اسے یکجا کر کے شائع کرنے کا خیال آیا۔

میرے خاوند معروف خاں اور میری طالبہ یاسمین اختر کے اصرار پر میں نے اپنے افسانوں کو یکجا کیا۔ مالی تعاون کے لئے راج بھاشا، بہار سے رابطہ کیا۔ راج بھاشا، بہار کے مالی تعاون سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ میں راج بھاشا، بہار کے تمام صاحب حل وعقد کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

حسن جبیں شکیل

حسن جبیں شکیل کا آئینہ خانہ

اردو ادب کو زرخیز بنانے کی کوششوں میں لگی خواتین کی جتنی بھی توقیر و تحسین کی جائے کم ہے۔ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی ذمہ داری نبھاہتی چوبیس گھنٹے مصروف رہنے والی عورت کو قلم کاریوں کے لئے کن مراحل سے گزرنا ہوتا ہوگا اس کا اندازہ بھی صرف ایک عورت ہی لگا سکتی ہے اور جو خدا کے فضل سے عورت ملازمت پیشہ بھی ہو حالات کتنے دشوار گزار ہوتے ہوں گے! محترمہ ڈاکٹر حسن جبیں درس و تدریس سے تعلق رکھتی ہیں، سوچتے جاگتے ذہن کی مالک ہیں۔ نسائی اور نفسیاتی مسائل، جھوٹے وقار، خاندانی اقدار کے نام پر کئے جانے والے استحصال کی ماری روزمرہ کے جیتی عورتوں کے کرب کا بیاں تو انہیں کرنا ہی تھا! پدرانہ نظام کے بنے بنائے تصورات سے باہر نکل کے سوچ لینا ہر عورت کے لئے آسان نہیں ہے۔ اسے تو اپنے صحیح معنوں میں عورت ہونے کا ثبوت دینے کے لئے شرم و حیا، وفا پرستی، قربانی اور ایثار کا مجسمہ بنے رہنا ہے۔ پدرانہ معاشرے کے رائج ان مفروضوں پر وہ صدقِ دل سے یقین کرنے لگتی ہے اور پدرانہ نظام کے بنے بنائے معیار پر پوری اترنے کی کوشش میں اس کا اپنا وجود کہاں گم ہو گیا، اس کا اسے پتا تک نہیں لگتا۔

مغربی دانش ور خاتون سیمون دی بوائر کہتی ہیں کہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ کوئی بھی عورت پیدائشی طور پر ان صفات کی حامل نہیں ہوگی۔ بچپن سے ہی اس کا برین واش، اس طرح کیا جاتا ہے

کہ وہ صدقِ دل سے اس پر یقین کرنے لگ جاتی ہے، انھیں سچ ماننے لگتی ہے۔ اگر بھولے بھٹکے اسے اپنا وجود کہیں نظر آ بھی جائے تو ''توبہ توبہ توبہ... غلط بات!'' کہہ کے منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔

مرد اور عورت جسمانی طور پر قدرے مختلف ہیں۔ لیکن مختلف ہونے سے کوئی کم تر تو نہیں ہو جاتا۔ پھر یہ معاملہ کیا ہے بھائی۔ خدا نے تو کوئی تفریق رکھی نہیں۔ گناہ عورت سے سرزد ہو یا مرد سے، سزا دونوں کے لئے برابر ہے۔ اچھے اعمال کی جزا بھی ایک سی رکھی ہے۔ ذہنی طور پر بھی عورت کسی مرد سے کم نہیں ہوگی۔ چاند پر جانے والے لوگوں میں عورت بھی شامل تھی کہ نہیں؟ اس کے باوجود آج بھی عورت کو ناقص العقل کہنے والے لوگوں کی کمی نہیں۔ نہ ہی ان کی جو عورتوں کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔

پہلے میں سوچتی تھی کہ شاید عورت کو یہ حیثیت مالی طور پر مردوں کی محتاج رہنے کی وجہ سے مل گئی ہے۔ مگر میری حیرانی کا انداز کیجئے جب میری نگاہ برسرِ روزگار عورتوں کے حالات پر پڑی۔ سکون اور ذہنی رفاقت تو انھیں بھی نصیب نہیں۔ گھر اور باہر دونوں جگہ ان کے استحصال کے لئے نت نئے طریقے آزمانے والے لوگ اچھی خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں، تو بھئی اب کیا کریں؟

معاشرے کی ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ مگر بدلیں تو کیسے؟ —— ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک ہر سطح پر ایک جنگ جاری ہے۔ ایک کی دوسرے پر حاوی ہو جانے کی خواہش کی کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ۔ جس میں شامل عورتیں بھی نظر آتی ہیں۔ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار عورتیں! ظالم ساسیں، خود غرض بہوویں، فتنہ انگیز نندیں، ایک عورت کے محبوب کو چالبازی سے ہتھیا لینے والی دوسری عورت! —— ان سب کا کیا کیا جائے بھائی!

محترمہ حُسنِ جبیں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کے ان نسائی، جذباتی اور معاشرتی مسائل سے قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش پوری ہمدردی اور دل سوزی سے کی ہے۔ ''آن'' میں ریحانہ اپنے شوہر سے انتقام لینے میں کامیاب ہونے کے بعد بھی خود سے ہاری اور بیقرار نظر آتی ہے تو ''بُہتان'' میں رضیہ کی عجب غضب کارستانیاں اسے مظفر و منصور بنا دیتی ہیں۔ ''آخری

داؤں‘‘ میں اپنے وجود کی مسلسل نظر اندازی کی ماری دل شکستہ زرّی اپنے کرب کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں اپنی جان سے ہی گزر جاتی ہے۔ ’’معاوضہ‘‘ اِدھر کی لڑکی اُدھر، ادلے بدلے والی ’’گلٹا‘‘ شادیوں سے ہونے والی تباہیوں کا آئینہ دار افسانہ ہے۔ جس میں سلمٰی کا جرأت مندانہ اقدام قابلِ تعریف اور تقلید نظر آتا ہے۔ ’’جھلستے پودے‘‘ شادیوں میں ’’سلامی‘‘ اور ’’تلک‘‘ کے نام پر زرِ خطیر لینے کی مذموم رسم کے خلاف اٹھائی ہوئی آواز ہے۔ اس افسانے میں شوہر کی محبت اور عیش و آرام ملنے کے باوجود ذہنی کرب میں مبتلا بے زبان بیوی کی عکاسی عمدگی سے کی گئی ہے۔ ’’چڑھتا سورج‘‘ بھی اسی موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ شکر ہے کہ اسے خوش انجامی نصیب ہوئی۔ ’’ذرا عمرِ رفتہ کو...‘‘، ’’دل ایک کعبہ‘‘، ’’مسرتوں کی قیمت‘‘، ’’دل‘‘، ’’اندھیرے اجالے‘‘، ’’داھا‘‘، ’’مذاقِ طرب آگیں...‘‘، ’’خامہ خوں چکاں‘‘، ’’بول انمول‘‘، ’’اک تبسّم کے لئے‘‘ یہ سارے افسانے جذبات کے بھنور میں غلطاں پیچاں ذہنی طور پر بالکل تنہا، بھرے پُرے گھروں میں پوشیدہ ویرانیوں کی آگاہی دینے والے افسانے نہیں وارداتیں ہیں جو ہمارے آس پاس آئے دن ہوتی رہتی ہیں اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔

’’از دل خیزد بر دل ریزد‘‘ یہ دل سے نکلے اور دل سے لکھے گئے افسانے ہیں۔ ڈاکٹر حسنِ جبیں کا اسلوب صاف سُتھرا اور دوٹوک ہے۔ بڑی سادگی سے اپنی بات کہہ جانے کا ہنر انہیں آتا ہے اور سب سے بڑی بات کہ ان کی تحریر سے صوبۂ بہار کی روزمرّہ زبان کی سوندھی سوندھی خوشبو پھوٹ کے نکل رہی ہے۔ مشامِ جان کو معطر کر رہی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ دعا گو ہوں کہ ان کی کاوشیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچیں اور انہیں قبولیت عامّہ نصیب ہو۔

بلقیس ظفر الحسن
ایف-۳، پوسا اپارٹمنٹ
سیکٹر-۱۵، روہنی، دہلی-۸۵

آن

کیا کریں بی بی، نصیب کی بات ہے۔ ماں باپ نے گو سبھی کچھ دیکھا تھا۔ ذات دیکھی، خاندان دیکھا، بَر دیکھا اور کیا دیکھتے؟ ہاں البتہ نصیب نہ دیکھا تھا۔ ایک بی بی نے اسے دیکھ کر بڑے زور سے سانس کھینچا۔

''ہاں بہن قسمت کی لکھی تو بھوگنی ہی پڑتی ہے۔ ماں باپ جنم دے سکتے ہیں، کرم نہیں دے سکتے ہیں''۔ دوسری خاتون نے یوں اظہار ہمدردی کیا۔

''اور کیا بہن۔ پھر یہ نئی بات تو نہیں۔ عورت تو ازل سے ابد تک یہی دکھ بھوگتی آئی ہے۔ کرموں بیٹی کے نصیب میں ہمیشہ سوکن کا جلاپا رہا۔''

وہ یہ ساری باتیں سنتی تو پتہ نہیں کیوں اسے بڑی الجھن ہوتی۔ ایک عجیب سی بے کسی وہ محسوس کرتی اور وہ اُن عورتوں سے دامن چھڑا کر بھاگ آتی۔

''ہاں بہن ازل سے ابد تک عورتوں کے ساتھ یہی سلوک ہوا ہے۔'' یہ جملہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا۔ ''ازل سے ابد تک یہی ہوتا آیا ہے۔ کیا اس لئے وہ بھی یہ سب چپ چاپ سہے

جائے؟ لیکن ...... اسے وہ منظر تو بھلائے نہیں بھولتا۔ جب اس کے سامنے اس کی موجودگی میں، اس کے اپنے شاہد نے جس کے پیار پر اسے اتنا ہی بھروسہ تھا جتنا خدا کی ذات پر، سُرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی ایک دلہن کو لا کھڑا کیا تھا۔ وہ ششدر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

کیا کسی کا حق چھیننا اتنا آسان ہے؟ کیا سہاگ کوئی مانگے کی چیز ہے کہ اسے یوں دوسروں میں تقسیم کر دیا جائے؟ اس نے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو بڑی دلیری سے اپنے حلق میں گھونٹ لیا اور اس گھر سے اپنی ایک ایک نشانی مٹانے لگی۔ اس نے اپنی ایک ایک چیز چن لی۔ سیندور کی ڈبیا، کاجل کی پنسل، نیل پالش، سینٹ سب چیزوں کو اس نے نیچے نالی میں بہا دیا۔ شاہد نے اسے لاکھ منایا، اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، مجرموں کی طرح سامنے کھڑا رہا۔ کہتا رہا۔ ''ریحانہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، خدا کی قسم تمہارے بغیر میرا وجود نامکمل ہے'' لیکن اس پر اثر نہ ہوا۔ اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ وہ شاہد کے منہ پر تھوک دے۔ وہ اس کے منہ پر تو نہ تھوک سکی ہاں! اپنی آنکھوں میں اُمنڈتے آنسوؤں کا گلا ضرور گھونٹ دیا۔ اس نے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارا وجود نامکمل تھا جب ہی تو تم نے یوں اس کی تکمیل کی۔''

جب وہ جانے کے لئے بالکل تیار ہوگئی تو شاہد نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ نظریں ہمیشہ کے لئے اس کے دل میں چبھ گئیں۔ اُف! وہ بولتی ہوئی نظریں! جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''کہاں جاؤں گی؟ شوہر سے لڑکر۔ کیا دنیا میں عزت پا سکو گی تم مجبور عورت۔''

اسی وقت اس نے قسم کھائی کہ وہ شاہد کو بتا دے گی کہ وہ مجبور نہیں ہے ـــــ کبھی نہیں۔ اسی لئے جب عورتیں اسے یہ سب پہننے کی ترغیب دیتیں تو وہ جھنجھلا جاتی۔

اور پھر اس نے وہی کیا جس کی اس نے قسم کھائی تھی۔ شاہد کی گورنمنٹ سروس تھی۔ اس نے ریحانہ کو منانا اتنا آسان سمجھا تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی اسے اپنی سروس کا خیال نہ آیا۔ ریحانہ نے ایک عرضی اپنی طرف سے بھجوا دی۔

نئی پود نے اس کے اس اقدام کو بڑا سراہا۔ ''بڑا اچھا کیا باجی آپ نے۔ آپ کو یہی کرنا

تھا۔اب جناب کے ہوش ٹھکانے آئیں گے۔"

لیکن اگلے وقتوں کے لوگوں نے اس اقدام کو تعریفی نظر سے نہ دیکھا۔ "عورت تو وفا و ایثار کا دوسرا نام ہے۔ظلم سہنا اس کی فطرت ہے۔مردوں سے ٹکر لینا کوئی اچھی بات نہیں۔" وہ کہتے۔

اس کے دل کی آگ ان باتوں سے سرد نہ ہوتی۔دن بھر وہ شاہد کو شکست دینے کے لئے طرح طرح کے منصوبے بناتی۔لیکن رات کی تنہائیوں میں شاہد کی محبت دیوار سے اترتی چاندنی کی طرح اس کے دل میں اتر آتی۔

شاہد تم بے وفا ٹھہرے۔تم نے یہ نہ دیکھا کہ عورت کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔شیشے سے بھی زیادہ نازک کہ ذرا سی ٹھیس پر جھنجھنا اٹھے۔مجھے تو تم سے بڑی محبت تھی۔تم......تم بھی تو مجھ سے والہانہ پیار کرتے تھے تم کہا کرتے تھے۔دنیا میں، میں تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہوں۔پھر مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی اور کیوں کر عزیز ہو گیا؟ تم نے میرا مقام دوسرے کو کیوں دے دیا۔بتاؤ تمہیں اس کا کیا حق تھا؟ تم تو صرف میرے تھے۔صرف میرے! تم دوسرے کے کیسے بن گئے؟ لوگ کہتے ہیں کہ میں عام عورتوں سے مختلف ہوں۔نہیں شاہد نہیں۔مجھ میں اور ایک عام عورت میں کوئی فرق نہیں۔میری دنیا میں کوئی جھانک کر دیکھے۔ہر عورت اپنے محبوب کے قریب صرف خود رہنا چاہتی ہے۔تمہارے قریب میں رہنا چاہتی ہوں، صرف میں۔عورت سب کچھ برداشت کر لیتی ہے۔"شاہد" اپنی توہین برداشت نہیں کر پاتی۔تم نے مجھے ٹھکرا دیا۔یہ زخم میرے سینے میں ہمیشہ رستا رہے گا۔"

وہ سوچتی جاتی اور تکیہ بھیگتا جاتا۔

ایک دن اس کے پاس شاہد کا خط آیا......بھئی خوب! بڑا اچھا ہتھیار استعمال کیا ہے۔نئی پود کی لیڈر جو ٹھہریں۔لیکن یاد رکھو۔میرا کچھ نہ بگڑے گا۔کسی کو بیمار ثابت کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔روپے میں بڑی طاقت ہے۔ریحانہ! ابھی وقت نہیں گیا ہے۔خدا کی قسم میں تم سے محبت کرتا ہوں۔تمہارا مقام اپنی جگہ ہے۔اسے کوئی کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتا——تم آ جاؤ ریحانہ

میں تمہارا منتظر ہوں......''

وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے خط پڑھتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کی نمی خشک ہوتی گئی۔ کیا شاہد نے جیسا کہا ہے ویسا ہی ہوگا؟ کیا دنیا سے انصاف بالکل اُٹھ گیا ہے؟ کل ہی اس کے ایک عزیز نے بتایا تھا کہ شاہد نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ وہ مستقل بیمار تھی، اس لئے اس نے دوسری شادی کی ہے۔

وہ آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ یہ بھرے بھرے بازو، یہ زندگی سے بھرپور آنکھیں، یہ صحت مند چہرہ۔ کیا دنیا اندھی ہے؟ کیا ڈاکٹر اندھے ہیں؟ شاہد اندھا ہوگیا تو زمانہ تو اندھا نہیں ہے۔ پھر آئینہ کو گھورتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''شاہد دل پر ہاتھ رکھ کے دیکھو۔ کیا اسی لئے رضیہ کو لائے ہو کہ میں بیمار ہوں۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ کیوں کسی کے اعتماد کو ٹھیس لگاتے ہو۔'' وہ آئینہ کے پاس سے ہٹ آئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے شاہد سے شدید نفرت ہے۔ اس کا طبّی معائنہ ہوا۔ اس نے ڈاکٹروں کا دامن پکڑ لیا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کی بھی ماں، بہن اور بیٹیاں ہوں گی۔ وہی لکھئے جو حقیقت ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔''

''آفت آپڑی ہے شاہد صاحب پر۔'' ریحانہ کے ایک بھائی نے بتایا۔ اس دفتر سے اس دفتر، پیروی کے لئے دوڑے پھرتے ہیں۔ نوکری خطرے میں ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بڑا لالچ دیا تھا۔ لیکن سب ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔

بڑی بوڑھیوں نے یہ سب سنا تو دانتوں انگلیاں دبالیں۔ کچھ نظریں نئی جوت سے چمکنے لگیں۔ قدسیہ خالہ کی آنکھوں میں صاف پشیمانی اور پچھتاوا تھا۔

''ہائے اللہ! ساری زندگی بھائی بھاوج کی خدمت کرتے گزری۔ شوہر نے پلٹ کر نہ پوچھا۔ اگر میں جانتی کہ میں بھی کچھ کرسکتی ہوں تو میں بھی دوڑاتی تھوڑے دنوں۔ یوں گھٹ گھٹ

کے تو نہ مرتی۔''

لیکن وہ......! اسے اس خبر سے نہ خوشی ہوئی، نہ غم۔ لوگوں نے کہا کہ اس نے شاہد کے غرور کو توڑ دیا۔ خدا جانے۔ اس نے تو وہی کیا جو اس کے دل نے کہا۔

تب بھی وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی، یادوں کی یورش سے پریشان ہو اٹھتی۔ شاہد کہتا تھا۔ دنیا کی نظروں میں تم سب سے حسین نہ سہی، میری نگاہوں میں تم دنیا کی خوبصورت ترین عورت ہو۔ جھوٹے ...... میں اتنی ہی خوبصورت ہوتی...... تو پھر...... پھر......'' اس کا گلا رندھنے لگتا۔

لپ اسٹک کبھی اٹھاتی تو ہاتھ کانپ جاتے۔ کاجل لگاتی تو آنسو اسے مٹا ڈالتے۔ کس کے لئے وہ سنگھار کرے؟ وہ نظریں اب کہاں تھیں جو اس کے حُسن کی بلائیں لیتیں، اس کی آرتی اتارتیں۔

وہ اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو حلق میں گھونٹ لیتی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ کوئی جذباتی کمزوری کبھی نہیں دکھائے گی۔

ایک دن جب ڈاکئے نے ایک نیلا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا تو وہ چونک پڑی۔ لکھا تھا: ''پیاری ریحانہ!۔ مجھے معاف کردو۔ (وہ چونک سی پڑی۔ اس نے حیرت سے نچلی سطروں پر نظر ڈالی) غلطی میری تھی۔ بھول جاؤ کہ ماضی میں کیا ہوا تھا۔ رضیہ کو میں طلاق دے دوں گا۔ اگر تم میرے ساتھ رہنے پر رضامند ہو جاؤ۔ بتاؤ تم راضی ہونا؟ ایک خط لکھ دو۔ میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔ رضیہ کا طلاق نامہ میرے ساتھ ہوگا۔'' تمہارا شاہد

اس کا دل چاہا کہ وہ خوب زور سے قہقہے لگائے۔ اتنی زور سے کہ چھت اُڑ جائے، در و دیوار ہل جائیں، آسمان کانپنے لگے۔ لیکن وہ یہ نہ کرسکی۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ پھر تو آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

اس نے خیال ہی خیال میں شاہد کو مخاطب کیا ''رضیہ کو اس کی دنیا مبارک شاہد۔ تم

اسے کیوں طلاق دو گے؟ طلاق تو تم نے مجھے دی تھی۔ اس دن جب تم نے میرے علاوہ کسی اور کو اپنے دل و دماغ میں بسالیا۔ تم نے بیوفائی کی ہے۔ شاہد تم کیا جانو کہ عورت کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر کبھی نہیں جڑتا۔ تم نے مجھے مجبور سمجھا تھا۔ اسی لئے میں نے یہ سب کیا۔ ورنہ... میں تو اسی دن تمہارے گھر سے اپنا وجود سمیٹ کے لے آئی تھی۔ جس دن تم نے رضیہ کو آنگن میں لا کھڑا کیا تھا۔

میں نے یہ سب ضد میں کیا اور ..... آخر تمہیں ہار ماننی پڑی۔ اب جیتی ہوئی بازی تمہارے ہاتھ سونپے دیتی ہوں۔ یہ احساس کہ تم نے مجھے مجبوری کی حالت میں اپنایا۔ کیا مجھے کبھی تمہارے دل کی گہرائیوں میں اترنے دے گا؟ نہیں کبھی نہیں۔ شاہد اب میں کبھی تم سے وہ محبت نہیں کرسکوں گی جس کے تم عادی تھے۔

عورت سب کچھ بھول جاتی ہے۔ اپنا ایمان کبھی نہیں بھول سکتی۔ تمہاری دنیا تمہیں مبارک۔ میں بخوشی تم سے علیحدگی اختیار کرلوں گی۔

تم نے میرے جذبات کی توہین کی۔ میری اَنا کو چکنا چور کیا۔ بتاؤ، اب میں تمہارے ساتھ کیسے رہوں ــــــ کیسے رہوں شاہد؟

پتہ نہیں کب تک وہ روتی رہی۔

بہتان

ایک ولی پر ایک عورت نے بہتان تراشا کہ ''اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کا باپ یہی شخص ہے''۔ بھرے مجمع میں وہ عورت قسم کھانے کو کھڑی کی گئی۔ ''اس ربّ رحیم و کریم کی قسم، میرے ہونے والے بچے کا باپ یہی انسان ہے۔''

اس ولی نے کہا ''نہیں اے عورت اس کے رحم و کرم کی نہیں، اس کے قہر و انصاف کی قسم کھا۔'' وہ عورت ہچکچائی پھر گویا ہوئی۔ ''اس ربّ قہار و جبّار کی قسم میرے ہونے والے بچّے کا باپ یہی انسان ہے۔'' ناگاہ ایک برق لہرائی اور چشم زدن میں اس عورت کو خاکستر کر گئی۔

وہ تو ایک اللہ والے کی بات تھی اگر کسی دنیا والے پر کوئی عورت یہ الزام رکھ دے تو وہ کیا کرے۔ میری برأت کا ثبوت میرے پاس کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ جب رضیہ نے مجھ پر یہ الزام لگایا تو میں نے سوچا۔ کاش میری زبان بھی کسی ولی کی زبان ہوتی۔ میری برأت بھی اسی طرح ثابت ہو جاتی۔ ورنہ میری بے گناہی کا میرے پاس کیا ثبوت۔ جب رضیہ نے میرے دوستوں،

ملنے جلنے والوں کی موجودگی میں مجھ پر بہتان باندھا تو میں دم بخود اسے تکتا رہا۔

یہ حسن، یہ پاکیزگی، یہ معصومیت، یہ تقدس اور یہ فریب، یہ جعلسازی کیا اس معصوم صورت لڑکی کو کوئی جھوٹا سمجھ سکتا ہے۔

خواہ لاکھ شہادتیں گذاری جائیں۔ لاکھ گواہیاں پیش کی جائیں۔ میں سوچتا رہا اور دماغ غصہ سے کھولتا رہا۔ آج اس نے مجھے کس طرح سبھوں کے سامنے ذلیل وخوار کیا۔ کیا میں کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہ تھا۔ اس لڑکی نے کس طرح مجھے اپنے دام میں پھنسانا چاہا۔ کیسے کیسے مجھے لبھایا—— مجھے وہ منحوس دن یاد آیا جب وہ لوگ میرے پڑوس میں نئے کرایہ دار کی حیثیت سے آئے تھے۔ بہت دنوں سے پڑوس کا مکان خالی تھا۔ روز کوئی نہ کوئی اسے دیکھ جاتا اور کرایہ سن کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ اسی روپے اور اتنا چھوٹا مکان!

لیکن ان لوگوں کو مکان کی اشد ضرورت تھی۔ تب ہی فوراً اس مکان میں اُٹھ آئے۔

وہ گرمی کی ایک دوپہر تھی۔ گرمی کی دوپہر میں یوں بھی بڑا سناٹا ہوجاتا ہے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں آرام کررہے تھے۔ میں بھی اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ایک کتاب کی ورق گردانی کررہا تھا۔ امّاں صحن میں ظہر کی نماز کے لئے وضو کررہی تھیں۔ شاہدہ اوپر زینے سے دوڑتی ہوئی آئی۔

بھائی جان! بھائی جان! بغل والے مکان میں نئے کرایہ دار آئے ہیں۔ کئی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ایک میرے عمر کی لڑکی ہے۔ بڑی خوبصورت سی، بڑی پیاری سی۔

شاہدہ بہت خوش تھی۔ اس کی عمر کی کوئی لڑکی پڑوس میں آئی تھی۔ اسے بڑی مسرت ہوئی۔ گپ شپ کریں گے۔ دوست بنائیں گے۔ اب تو مزہ آئے گا۔

میں شام کو باہر نکلا تو دیکھا کہ نئے کرایہ دار کے بچے باہر کھیل رہے ہیں۔ میں اس مکان کے سامنے سے گذرا۔

ایک خوبصورت سا چہرہ مجھے کھڑکی میں نظر آیا جو میرے دیکھنے پر کھڑکی کے پٹ کی

اوٹ میں ہو گیا۔

''واقعی بڑا حسین چہرہ ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں شاہدہ کی تائید کی ——
دوسرے دن وہی چہرہ مجھے اپنے گھر میں نظر آیا۔ وہ لڑکی اماں اور شاہدہ کے پاس بیٹھی یوں باتیں کر رہی تھی جیسے بہت پہلے سے انہیں جانتی ہو۔

میں درانہ آنگن میں چلا آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک گیا۔ واپس مڑنے والا تھا کہ اس نے میری طرف سے پیٹھ کر لی اور امّی سے کہا —— آنے دیجئے، اتنے قریب رہ کر پردہ کہاں ہوسکتا ہے۔'' میں سر جھکائے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پھر تقریباً روز اس لڑکی سے میرا سامنے ہونے لگا۔

کبھی گلی سے گذرتے ہوئے وہ اپنے مکان کی کھڑکی میں نظر آئی، کبھی پاس پڑوس کے کسی مکان میں اس کا جلوہ نظر آیا۔ میرے گھر تو وہ تقریباً روز ہی آتی تھی۔ شاہدہ سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ بڑی آزاد خیال لڑکی ہے۔ وہ مجھ سے بڑی حد تک فری ہوتی جارہی تھی۔ ایک دن تو شاہدہ کے ساتھ میرے کمرہ میں چلی آئی —— میں گھبرا گیا۔ میرا کمرہ کبھی بھی اچھی حالت میں نہیں رہتا تھا۔ میں تھا ہی لا ابالی ٹائپ کا آدمی اور شاہدہ کی مجھ سے ہمیشہ لڑائی رہتی۔ وہ کبھی میرا کمرہ درست نہیں کرتی تھی —— میں نے اس سے معذرت کی تو اس نے کہا —— کوئی بات نہیں۔ آپ سے شاہدہ سے لڑائی ہے۔ میں آپ کا کمرہ درست کر دیا کروں گی۔

میں خاموش ہو رہا۔ بھلا اسے کیا غرض پڑی ہے کہ میرا کمرہ درست کرتی پھرتی لیکن ایک دن جب میں کالج سے واپس آیا تو اپنا کمرہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

ٹیبل پر سب کتابیں قرینے سے بجی ہوئی تھیں۔ ٹیبل کلاتھ، تکیہ کا غلاف، چادر سب بدلے ہوئے تھے۔ پھولوں کا گلدستہ سرہانے کی میز پر رکھا گیا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ سب رضیہ کے ہاتھوں کے کرشمے ہیں۔ دوسرے دن رضیہ آئی تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں میرے لئے ایک پیغام ہے۔

مجھے بھی وہ اچھی لگتی تھی۔ ویسے وہ تھی ہی اتنی حسین وخوبصورت لڑکی کہ ہر ایک اس کے حسن سے متاثر ہوتا—— لیکن وہ تھوڑی بے حجاب تھی۔ جلد ہی ہر ایک سے فری ہو جاتی۔ آخر میں اس کا کون تھا وہ جو وہ مجھ سے اتنی قریب ہوگئی تھی۔ اکثر میں چھت پر جاتا۔ اس کی چھت اور میری چھت ملی ہوئی تھی۔ اگر کبھی وہ بھی چھت پر رہتی تو میں واپس مڑنے لگتا۔ وہ مجھے روکنے لگتی۔ ایک دن تو روکتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے اس کی یہ باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔

اگر اس میں عام لڑکیوں جیسی شرم وحیا رہتی تو شاید میں اس سے محبت کرنے لگتا۔ لیکن اس کی ان حرکتوں سے میں اس سے ایک طرح کی نفرت کرنے لگا تھا—— میرے گھر میں وہ بہت آزادانہ آتی جاتی تھی۔ جب وہ مجھ سے اسی حد تک بے تکلف تھی تو کیا عجب کہ دوسرے مردوں سے بھی اسے کوئی تکلف نہ ہو یا ہو اور مجھے یہ سوچ کر بُرا سا لگتا۔ میرا جی چاہتا کہ اسے ہر جگہ جانے سے منع کر دوں۔ لیکن...... لیکن...... مجھے اس کا حق ہی کیا تھا۔

ایک دن...... ایک دن...... تو اس نے ایسی بے ہودہ حرکت کی کہ مجھے اس سے نفرت ہوگئی۔ میں اپنے کمرے میں تنہا تھا۔ وہ آگئی۔ بالکل میرے قریب، کہ میں اس کی سانسوں کی گرمی اپنے چہرہ پر محسوس کرنے لگا۔

''اظہر میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رضیہ کل سے تم میرے یہاں نہیں آؤ گی۔ تمہیں شرم نہیں آتی، غیر مردوں سے اظہار عشق کرتے ہوئے، بے شرم۔ میں غصہ سے کانپ رہا تھا۔ وہ ڈر گئی۔ وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ خفت اور شرمندگی کے احساس نے اس کو پسینے پسینے کر دیا تھا۔

پھر وہ میرے گھر میں نظر نہیں آئی۔ میں نے شاہدہ کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ اب رضیہ سے کبھی نہ ملے گی۔ کئی ماہ گذر گئے۔ ایک دن میرے دوست کلیم نے مجھ سے ایسی بات کہی کہ میں پاگل ہو اٹھا—— 'کہا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ دماغ میرا خراب نہیں ہوا ہے۔ دوست۔ عنقریب تمہارا ہونے والا ہے۔ ابھی تو میں نے ہی تم سے کہا ہے۔ باہر جاؤ۔ محلے کا ہر

آدمی تم سے ہی پوچھتا نظر آئے گا۔ رضیہ تو بڑی بیباکی سے تمہارا نام لیتی ہے۔

صدمے اور رنج سے میں نے اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اپنی بے گناہی کے ثبوت کے لئے کیا ثبوت لاؤں۔ اگر ایسا الزام کوئی عورت کسی پر رکھ دے تو دنیا کا کوئی مرد اپنی برأت کے لئے کون سی شہادت پیش کر سکتا ہے۔ میں خود کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اب ابا سنیں گے۔ امّی کو خبر ہوگی۔ عزیزوں میں چرچا ہوگا۔ چھوٹی بہن کے آگے کیا عزّت رہے گی۔ بے بسی سے میں رونے لگا۔

کلیم کو مجھ پر بڑا ترس آیا۔ اس نے کہا ٹھہرو۔ میں اسے اپنے سب دوستوں کی عدالت میں کھڑا کروں گا۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس سے قسم کھلواؤں گا۔ دیکھتا ہوں۔ اتنی نگاہوں کا مقابلہ وہ کیسے کرتی ہے۔

آخر کئی دنوں کی محنت کے بعد کلیم نے اسے اپنے گھر بلایا۔ وہاں پہلے ہی سے اس نے اپنے دوستوں کو جمع کر رکھا تھا۔ احمؔد، رشیؔد، مرزؔا، محمودؔ یہ سب ہم دونوں کے گہرے دوست تھے۔ ان سبھوں میں رضیہ نے مجھے بدنام کیا تھا۔ اس لئے کلیم کی خواہش تھی کہ یہ بدنامی کا جوا، ان لوگوں کے سامنے ہی میرے سر سے اترے۔ مجھے بھی وہ لوگ بلا کے لے گئے تھے، ورنہ اس دن کے بعد سے میں گھر سے باہر نہ نکلتا تھا۔ ہر وقت منہ لپیٹے کمرہ میں پڑا رہتا۔ مجھے دنیا کو منہ دکھاتے شرم آئی۔ پتہ نہیں لوگ کیا سوچتے ہوں گے۔ کس نظر سے مجھے دیکھیں گے میں تو کلیم کے یہاں جانے کو بھی تیار نہیں تھا۔ وہ زبردستی مجھے گھسیٹ کر لے گیا۔

حالانکہ وہ سب میرے گہرے دوست تھے۔ رضیہ نے اس طرح مجھے بدنام کیا تھا کہ ان لوگوں سے بھی نظریں چار کرتے گھبرا رہا تھا۔

کلیم نے رضیہ کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔ رضیہ کے آنے پر میں نے اسے دیکھا اُف اتنی حسین و معصوم لڑکی اور ایسی، اس نے کیا کیا کہا میں نے کچھ نہ سنا۔

"میں قسم کھانے کو تیار ہوں" رضیہ کی آواز جھناکے کے ساتھ میرے کانوں میں گونج

گئی۔ میں اور میرے دوست چونک پڑے۔ یہ امید کسی کو بھی نہیں تھی کہ وہ یوں سبھوں کے سامنے سفید جھوٹ پر کمر باندھے گی۔ کلیم کو تو بڑا دعویٰ تھا۔

آخر تو ہے ایک لڑکی ذات، اتنے لوگوں کے سامنے خدا اور رسول کے حوالے سے یوں قسم نہ کھائے گی۔ پھر ہم اسے وہ چک پھیریاں دیں گے کہ اسے سچی بات اگلتے ہی بنے گی۔

وہ.........وہ تو کہہ رہی تھی۔

''ہاں! خدائے قدوس کی قسم میرے ہونے والے بچے کے باپ اظہر ہیں۔

میں بے ہوش سا ہونے لگا۔ میں نے سوچا کاش میرے منہ میں بھی اس ولی کی زبان ہوتی۔ ایک بجلی آسمان سے گرتی اور اس عورت کو خاکستر کر دیتی اور اس طرح.........اس طرح خدا میری برأت ثابت کر دیتا۔

لیکن اچانک ایک غصے کی لہر میرے سارے جسم میں دوڑنے لگی۔ میں تیر کی طرح اٹھا۔ اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس کے کاندھے جکڑ لئے ——— ''بولو...... بولو میں اس بچے کا باپ ہوں جس کی تم ماں بننے والی ہو۔'' دیکھو.........اِدھر......دیکھو میری آنکھوں میں۔ تم جس کی ماں بننے والی ہو اس کا باپ.........''

رضیہ پر ایک جھٹکا سا لگا۔ میں کسی کی ماں بننے والی نہیں۔ وہ روتی ہوئی میرے قدموں میں جھک گئی۔

میں بے داغ ہوں بالکل بے داغ۔ میں کسی کی ماں واں بننے والی نہیں اور خدا کی قسم میں نے کوئی جھوٹی قسم نہیں کھائی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے۔ میرا کوئی شریک زندگی ہوگا تو تم، ورنہ کوئی نہیں اور پھر.........جب بھی میں کسی بچے کی ماں ہوں گی وہ تمہارا ہوگا۔''

اور اظہر اس کے لئے۔ اس چاہت کے لئے مجھے معاف کر دو۔ تمہیں پانے کے جذبے نے مجھ سے یہ پاگل پن کرایا۔ میں نے سمجھا کہ اس طرح میں تمہیں پا لوں گی۔

لیکن نہیں! نہیں تمہاری وہ آنکھیں! وہ نفرت کی تیز آنچ! جس نے مجھے جھلسا دیا۔ نہیں! میں تمہیں کبھی حاصل نہ کر سکتی۔

اظہر مجھے معاف کر دو۔ میں نے اپنے اوپر بھی بڑا ظلم کیا۔ ایک ایسی بیہودہ بات جس کا خواب میں بھی، میں تصور نہیں کر سکتی اپنے سے منسوب کر لی۔ اپنے دامن کو خود آلودہ کیا——وہ پتہ نہیں کیا کیا کہے جا رہی تھی۔ وہ اپنے آپے میں نہیں تھی۔

زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب انسان فرشتوں کی طرح معصوم ہو جاتا ہے اس پر نیکیوں اور سچائیوں کا نور برستا ہے۔

شاید اس کی زندگی کا بھی یہی مبارک لمحہ تھا۔ وہ میرے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی۔ میرے دوست دم بخود تھے۔ انگشت بدنداں۔

اچانک مجھے ایسا لگا کہ اس ولی کی زبان اللہ نے میری منہ میں رکھ دی——یوں اس نے میری برأت بھی ثابت کر دی اور......اب......اب کیا ٹھوکر میں پڑی اس ہستی کو جس پر نیکی اور سچائی یوں ٹوٹ کے غالب آئی ہو، گلے لگانا کسی ولی کا فعل نہ ہوتا اور میں نے اسے گلے لگالیا۔

☆☆

آخری داؤں

ایک ننھی سی چیخ کے ساتھ اس نے اپنے وجود کا اعلان کیا اور بند کمرے کو تھوڑا سا بھیڑ کر نکلتے ہوئے بوا نے کہا۔

بڑی بیگم۔ ''بیٹی مبارک ہو مبارک'' بڑی بیگم کی آواز میں نہ گرمجوشی تھی نہ سردمہری۔ بس کچھ ایسے ہی ساری زندگی اس کا استقبال ہوا۔ ساری زندگی اس نے ایسی ہی سردمہری اور گرمجوشی کے درمیان اپنے وجود کو سنبھالے رکھا۔

اس کا وجود ماں کی گود میں چند دنوں کلکاریاں مارتا رہا، پھر انگوٹھا چوستا رہا۔ ننھے ننھے قدموں سے باپ کے گرداگرد چکّر لگاتا رہا۔ پھر آنگن دہلیز اور گھر کی چہار دیواری کے گرد چکّر لگاتا یہ ننھا سا وجود اپنی گڑیوں میں کھو گیا۔

اپنی دنیا میں، اپنی ہستی میں، نہ اس کے وجود کو کوئی خاص اہمیت ملی نہ کوئی خاص غفلت۔ اس کے کپڑے بنتے، اس کے دوپٹے آتے، اس کی گڑیا خریدی جاتیں۔ طرح طرح کے کھلونے آتے۔ یہ سب ضروریات کچھ ایسے پوری ہوتیں جیسے اس کا پورا ہونا ایسا ہی ہو، جیسے بستر کی چادر بدلنا، ماسٹر کی فیس دینا یا اسکول کا 'یونیفارم' بنانا۔

غرضکہ گھر کی اور ضروریات کی طرح اس کی ضروریات بھی پوری ہوتیں۔۔۔ کوئی خاص چاہت، کوئی خاص اہمیت نہیں...... کبھی نہیں ـــــــــ لیکن اس کو اس نے صرف محسوس کیا۔ ورنہ دنیا میں اور بیٹیاں تو بڑے فخر سے کہتی ہیں ''بھئی میرے ابا مجھے بہت چاہتے ہیں۔ جو میں نے منہ سے نکالا کیا مجال کہ وہ فوراً پورا نہ ہو۔''

تو کیا اس کے ابا ایسا نہ کرتے تھے۔ وہ بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن وہ عام لڑکیوں سے ذرا مختلف تھی۔ اس نے چاہت اور ضرورت کے فرق کو اپنے وجود کے پہلے دن محسوس کیا تھا۔ سرد مہری اور گرمجوشی کے درمیان کے فاصلے اس نے اپنے قدموں سے طے کئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کوئی بھی اپنی ضرورت بابا تک لے جائے تو وہ اسے ضرور پوری کراتے۔ کیا اس نے نہیں دیکھا تھا کہ ماما نے کوئلوں کے لئے کہا کوئیلہ حاضر۔ عبدل بابا نے بینائی کی کمزوری کی شکایت کی چشمہ موجود۔ رفیق نے برش کے لئے کہا۔ کئی کئی برش ایک ساتھ آ گئے۔ پھر اگر اس کی ضرورت بھی منہ سے نکلتے ہی پوری ہوگئی تو کیا خاص بات ہوئی۔ بات تو جب ہوتی، جب اوروں کی ضروریات کی تکمیل میں کچھ وقفے لگتے۔۔۔ بس یہ سب کچھ صرف وہ سوچتی۔۔۔ اور بس احساس کی یہ ڈور اس کے دماغ میں مضبوطی سے تنتی گئی۔ وہ اپنے وجود کو منوانے کی فکر میں اپنی ہستی میں گم ہوتی گئی۔ کمرے میں بند اپنے آس پاس گڑیا سجائے وہ بیٹھی رہتی۔ گڑیا اس کے گرد گھیرا بنائے بیٹھی رہتیں جیسے چاند کے گرد ہالہ۔ یوں وہ اپنی اَنا کو تسکین دیتی۔

وقت چپکے چپکے اس کے پاس سے گزرتا رہا۔ پھر اچانک سے ایسا محسوس ہوتا جیسے گھر کے سارے لوگ اس میں دلچسپی لے رہے ہوں۔ اس کا وجود ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ کچھ چونک سی پڑی۔ گھبرا گھبرا کے اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف اسی کا ذکر، اسی کے چرچے۔ ماماٗئیں اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتیں۔ امی اس کی آرائش کا سامان منگواتیں۔ دادی اماں کی اس پر تنقیدی نظریں پڑتیں۔ جانے کیا بات ہوگئی تھی۔ اس کا دل خوشیوں سے مچل اُٹھا۔ پھر اس کی شخصیت انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے وجود کے شیشے پر پڑی بے توجہی کی گرد

آہستہ آہستہ جھڑنے لگی اور اس کا سراپا جھلملاتے ہوئے شفاف آئینے کی طرح چمکنے لگا۔ خوابوں کے دریچے آہستہ آہستہ کھلنے لگے اور تمنائیں و آرزوئیں ان سے جھانکنے لگیں۔

ان آرزوؤں اور تمناؤں نے ایک پیکر کا روپ دھار لیا۔ ایک جیتے جاگتے وجود کا۔ اور وہ اس میں کھوتی گئی۔ گڑیا بے حقیقت ہوتی گئیں۔ تنہائیاں کاٹنے کو دوڑنے لگیں۔ اب ضرورت ہی کیا تھی۔ اب تو ہر طرف اسی کا وجود تھا۔ اسی کی شخصیت تھی۔

یہ زری کا جوڑا ہے، یہ زری کا مانجھا ہے، یہ زری کا جہیز ہے، یہ زری کے زیورات ہیں، یہ زری کا دلہا ہے۔ ہر طرف وہ تھی، صرف وہ۔

پھر اسے اپنی تنہائیاں کیوں عزیز ہوتیں۔ سارے گھر میں وہ، وہ گوشے میں جا چھپے۔

وجود کے ان ہی شور شرابے میں وہ مایوں بیٹھا دی گئی۔ شہنائیاں بجیں، بابل گائے گئے اور نور کی برأت میں اسے رخصت کیا گیا اور اس کا وجود سوکھی لکڑی کی طرح پٹ سے ٹوٹ ٹوٹ گیا۔ لوگوں نے اس کا جیون ساتھی بغیر اس کی رائے لئے منتخب کر لیا۔ اس کا شریک زندگی اور اس کو کچھ خبر نہیں! کیا وہ بے جان مٹی کی کوئی مورت ہے کہ جسے چاہا تھما دیا۔ یہ اس کی شخصیت اور اس کی ہستی کی طرف سے کیسی بے توجہی ہے، کیسی بے پرواہی ہے۔ کیا اس سے پوچھا جاتا تو وہ انکار کر دیتی۔ صرف دو حرف منہ سے نکال لیتے۔ جھوٹے منہ ہی پوچھ لیتے تو اس کا وجود یوں ریزہ ریزہ نہ ہوتا۔ اس کی خودی یوں مجروح نہ ہوگی۔

پھر یہ چند دنوں کا کیسا ڈھکوسلہ تھا۔ اس کی یہ اہمیت، اس کا یہ مان، یہ عزت، یہ سب کیا تھا۔ شاید اس کی ہستی کو مٹانے کے لئے تھوڑے دنوں اسے یوں تسلیم کیا گیا تھا۔ اسے قربانی کے وہ جانور یاد آئے جنھیں ذبح کرنے سے پہلے کچھ نہ کچھ کھلایا جاتا ہے۔

اور تازیانے پر تازیانے لگتے گئے۔ وہ دلہن بن کے سسرال گئی۔ لوگوں نے گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر دوسرا سوال یہ کیا گیا ”اکبر میاں تو خوش ہیں“ اس کا دل اپنے سینے میں تڑپا اور پھر خاموش ہو گیا۔

''کیوں ری زری تجھے اکبر میاں پسند آئے۔'' کسی نے یہ نہ پوچھا۔ کیوں تیرے چہرے پر جو اللہ میاں نے دو کالی کالی آنکھیں دی ہیں، وہ بے نور ہیں کیا۔ تیرے سینے میں جو دل ہے وہ جذبات واحساسات سے خالی ہے کیا؟ تیرے منہ میں زبان بھی ہے یا صرف دو گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ ہیں اور کچھ بھی نہیں۔

ان ساری چیزوں کا مصرف کیا ہے۔ صرف یہ کہ تو کسی کو پسند آجائے۔ کوئی تجھے اپنا کر اپنے کمرے کی، اپنے گھر کی یا زندگی کی آرائش بنالے۔ پھر اس نے ایک گڑیا کیوں نہ خرید لی۔ خوبصورت سی، من موہنی سی۔ ٹیبل پر اٹھا کے رکھ دیتا تو بھی کمرے کی زینت ہو جاتی۔ کیا ضرورت ہے کہ گوشت پوست کا جسم ہو۔ جس کے دل کی دھڑکن اور نبض کی آہٹ سننے کے لئے اس کے پاس قوت سماعت نہ ہو۔

گلہ کس سے کیا جائے، شکوہ کون کرے۔ وہ اکثر اداس ہو جاتی۔ سسرال والے واری، صدقے ہونے لگتے۔ ''کیوں دلہن سر میں درد ہے۔ پاؤں میں تکلیف تو نہیں''۔ یہ بیچارے کیا جانیں کہ سر اور پاؤں کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں جہاں درد اٹھتا ہے کسک ہوتی ہے۔

یہ بات نہیں تھی کہ اسے اکبر ناپسند تھے۔ سب سے پسندیدہ بات تو یہ تھی کہ وہ اسے دل سے چاہتے تھے۔ اس سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔ ان کا والہانہ پیار۔ ان کا خلوص۔ وہ اکثر سوچتی کہ اس کا شریک حیات ایسا نہ ہوتا تو کیسا ہوتا۔

ان سے اسے کوئی شکایت بھی نہ تھی۔ اسے گلہ کسی سے بھی نہیں تھا اور اگر تھا تو ساری دنیا سے تھا۔ اپنے وجود سے یہ بے تعلقی، یہ بے حسی۔ جس نے اسے تباہ کر دیا۔ اس کے دل و دماغ میں نفرت بھر گئی۔ اپنے سے، اپنے وجود سے۔ اپنی ہستی سے اور پھر اسی نفرت اور محبت کے درمیان اس نے چار بیٹیوں کو جنم دیا۔ مشینی انداز میں۔ اپنے جذبات، اپنے احساسات سے بہت دور ہو کر۔

لیکن تمناؤں کو لوگ کیا کرتے۔ سب سے پہلے بیٹی کی دادی کے دل میں پیدا ہوئی۔

ایک بیٹی ہوتی تو دادی کے سر کے سفید بال چنتی، وہ ٹھنڈی سانس کھینچ کر رہ جاتیں۔

رشتے کی دیورانیاں، جٹھانیاں سنانے کو کہتیں۔ ''ارے بھئی بیٹی ہی تو ماں باپ کی سچی رفیق وہمدم ہوتی ہے۔ ورنہ بیٹے کس کام کے جب تک کنوارے رہے تو واری، صدقے اور بیوی آئی تو مکان ڈھونڈھنے لگے۔

اور ایک دن حد ہوگئی۔ اکبر نے بھی اپنی تمنا اس کے آگے رکھ دی۔ بھئی دکان میں بڑی پیاری پیاری فراکیں بک رہی تھیں۔ میں بھلا کس کے لئے لاتا۔

وہ سکتے میں رہ گئی۔ بیٹا بیٹی کوئی اس کے اختیار کی بات تو نہیں۔ بس جو خدا دے دے۔ لیکن نہیں وہ تنہائیوں میں خود سے جھوٹ نہیں بولے گی۔ اس نے بھی بیٹی پیدا کرنے کی بات نہیں سوچی، وہ ایک اور وجود کو یوں ٹھکرائے جانے کے لئے پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ اس کے وجود کی دوسری موت ہوگی۔ اس کا وجود تو فنا ہو ہی چکا۔ بیٹی پیدا کر کے وہ دوبارہ اپنی ہی ہستی کی موت نہیں چاہے گی۔ بیٹی کے ذکر سے اس کے دماغ کی رگیں تننے لگتیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا۔ سماج کی روش بدل گئی۔ اب بیٹا بیٹی سب برابر ہیں۔ لیکن نہیں! یہ کون کہتا ہے۔ بیٹی کا وجود صرف جسمانی وجود ہے۔ ذہنی طور پر اس کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے خیالات، اس کے اصول لاکھ اعلیٰ ہوں۔ اس کو کوئی بھی اہمیت نہیں۔ یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں۔ اس میں کوئی ناموری نہیں۔ اس کی کیا پسند ہے، کیا ناپسند ہے۔ ان اہم معاملات میں اس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

کم وبیش ہر طبقہ میں یہ فرق موجود ہے۔ سارے دعوے غلط۔ سارے خیالات جھوٹے۔ یہ سب سوچتی اور اس کے دماغ کی رگیں کھنچتی جاتیں۔

پانچویں بار بھی اس نے بیٹے کو جنم دیا۔ ساس کا منہ لٹک گیا۔ شوہر اداس ہو گئے۔ لیکن وہ کیا کرتی۔ اس کے بس میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نفرت کے احساس کو وہ کیسے کھرچتی۔ اپنے وجود سے محبت کی انتہا نے اس نفرت کو جنم دیا تھا۔

پھر شاید ان لوگوں کی دعاؤں نے اسے وقت سے پہلے پر امید کر دیا۔ سبھوں کے چہرے کھل اٹھے۔ دعائیں ہونے لگیں۔ اکبر اسے خود بزرگوں کے مزاروں پر لے گئے۔ ساس نے گلے اور بازوؤں پر ڈھیروں تعویذ باندھے۔

اور وہ...... وہ ہٹ سی بنی رہی۔ اس نے اپنے دماغ کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ ہر خیال سے پرے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی نفرت اس کی محبت پر حاوی ہے۔ وہ خود کو کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہ دیتی۔ ہر وقت خود کو مصروف رکھتی۔ پیدائش کے دن قریب آتے گئے ——— اور ایک دن زیست وموت کی کشمکش شروع ہو گئی اور اس کا وجود ننھے تنکے کی طرح لرزنے لگا۔ وہ بیڈ پر ڈال دی گئی۔ بالکل مُردوں کی طرح وہ بیہوش تھی۔

پتہ نہیں کتنی دیر بعد ایک وجود کی ننھی سی چیخ نے اس کے احساس کو تڑپایا۔

بالکل ویسی ہی چیخ! اس کی پہلی چیخ، اس کے وجود کی پہلی موت، اس کی آخری موت، اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا گیا اور ڈاکٹروں نے مایوسی سے اس کی نبض پر سے ہاتھ ہٹالیا۔

”اکبر صاحب، مجھے افسوس ہے کہ بچی تو بچ گئی۔ لیکن اس کی ماں کو ہم نہیں بچا سکے۔“

☆☆
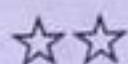
کوھمرے کا گھر

بھابی بیگم مبارک ہو! بھئی میں نے ابھی ابھی کوھمرے کا گھر دیکھا ہے۔ صفیہ پھوپھی کی سانس جوش جذبات سے پھول رہی تھی۔

''سچ صفیہ بیگم! کہاں دیکھا تم نے کوھمرے کا گھر''۔ بیگم صاحبہ نے بیقراری سے دریافت کیا۔

ارے وہ بیٹھک والا دروازہ ہے نا۔ اس کی دراڑ میں کوھمرے نے بڑا پیارا سا ننھا سا گھر بنایا ہے۔ میں زبیر کو پکارنے بیٹھک میں گئی تو میری نظر پڑ گئی۔ پھر میں الٹے پیروں آپ کو سنانے آ گئی۔ یقین جانئے بھابی بیگم! جب بھی کوھمرے نے گھر بنایا، گھر میں بہو بیٹیوں کا پاؤں ضرور بھاری ہوا۔ میں تو کہوں کہ اسے پہلے ہی آگاہی مل جاتی ہے۔ اب انشاء اللہ آفتاب بیگم اُمید سے ہوں گی۔ خدا آپ کو پوتا کھلانا نصیب کرے۔

''تمہارے منہ میں گھی شکر صفیہ بیگم۔ میں تو اسی امید پر زندہ ہوں۔ خدا وہ دن جلد لائے۔''

لیکن بھابی بیگم! سبھوں کو ہدایت کر دیجئے کہ کوئی کوھمرے کے گھروندے کو ہاتھ نہ لگائے۔ بڑے بوڑھے منع کرتے ہیں۔ دوبار، خدا محفوظ رکھے، ایک بار آفتاب دُلہن کے ساتھ ایسا ہو بھی چکا ہے۔

ہاں صفیہ بیگم، ٹھیک یاد دلایا تم نے۔ ارے زبیر، محسن کہاں رہ گئے تم لوگ۔ دیکھو وہ جو بیٹھک والا کمرہ ہے اس کے سامنے والے دروازے کو تم لوگ ہاتھ نہ لگانا۔ اسے جھاڑنے پونچھنے کی ضرورت نہیں۔ اس میں کوھمرے نے گھر بنایا ہے وہ ٹوٹنے نہ پائے۔

ملازموں نے بڑی بیگم کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا اور جب بیٹھک کے دروازے پر گرد اور مکڑی کے جالے دیکھ کر آفتاب احمد نے ان سے باز پرس کی۔

''کیوں بھئی، تم لوگ دیکھنے کے لئے ہو۔ یہ گرد، یہ جالے کیسے ہیں۔ کیا میں اسے صاف کردوں؟'' ملازموں نے بڑی بیگم کے حکم کو ان کے گوش گزار کر دیا۔

''حضور! بیگم صاحبہ کا حکم ہے۔ بیٹھک کا دروازہ جھاڑا پونچھا نہ جائے۔''

''کیوں؟ آفتاب احمد اچنبھے میں پڑ گئے۔ امّی نے ایسا حکم دیا ہے۔ وہ تو خود صفائی کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ انہیں کبھی ملازموں کو اس کے لئے ٹوکنا نہیں پڑا۔ اور آج؟

وہ زنان خانے میں گئے تو بڑی بیگم سے پوچھ ہی لیا۔ ''کیوں امّی۔ یہ آپ نے زبیر کو ڈرائنگ روم کے دروازے کی صفائی سے کیوں منع کیا ہے۔''

''بیٹا! کہیں تم نے اس کی صفائی تو نہیں کروادی''۔ بڑی بیگم نے بے تابی سے پوچھا اور بڑی بیگم کی یہ بے چینی دیکھ کر آفتاب احمد گھبرا سے گئے۔

''کیوں؟ کیوں؟؟ آخر کیا بات ہے۔ امّی؟ آپ اتنی گھبرا کیوں گئیں؟''

''ارے میاں، بہت سی باتیں تم لوگوں کے جاننے کی نہیں ہوتیں؟ صفیہ پھوپھی نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں پھوپھی جان! مجھے بتایئے کہ کیا بات ہے؟''

''مجھے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم نے کوھمرے کا گھر توڑوا تو نہیں دیا؟'' بڑی بیگم بے حد پریشان تھیں۔

کوھمرے کا گھر؟؟ کیا معمہ ہے۔ آفتاب احمد مجسم سوال بن گئے۔

ارے میاں تم تو جان ہی کو آگئے۔ کوھمرے کا گھر اس بات کی علامت ہے کہ گھر میں بہو بیٹیاں ضرور امید سے ہیں۔ اب دیکھو خدا کی شان ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا ہے اسے کہ گھر بنانے سے خدا نے تمہارے یہاں نئے مہماں کے آنے والے کی خوشخبری سنا دی۔ صفیہ پھوپھی کو آخر بتانا ہی پڑا۔

بھئی کمال ہو گیا آپ لوگوں کی توہم پرستی کا۔ بزرگوں کے سامنے اس ذکر پر آفتاب احمد کچھ جھینپے بھی۔ انہیں کل ہی آفتاب دلہن نے اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ بتائی تھی۔ پھر آفتاب احمد نے نوکروں سے صفائی سے متعلق کوئی باز پرس نہیں کی اور کوھمرہ اپنے گھروندے کی تعمیر میں مصروف رہا۔ وہ کچی کالی کالی مٹی اپنے پروں میں چھپا کے لاتا اور تیزی سے اپنے گھروندے پر جماتا جاتا۔ آہستہ آہستہ اسے چکنا کرتا، پروں سے سنوارتا، منہ سے برابر کرتا۔ کبھی اِدھر اُڑ کے، کبھی اُدھر اُڑ کے خوبصورت محرابی دیوار اونچی اٹھتی اور کچی مٹی منٹوں میں سوکھ جاتی۔ آفتاب دلہن دوپہر میں صوفے پر لیٹی دلچسپی سے اس کی اس صنعت کاری کو دیکھا کرتیں۔ انہیں ایسا لگتا جیسے وہ خود بھی ایک ایسا ہی گھروندا۔ ایک ایسی ہی عمارت کی تعمیر میں مصروف ہوں۔ ماہ بہ ماہ، دن بہ دن یہ عمارت تکمیل کی سرحدوں کو چھو رہی ہو۔ ہر ماہ وہ اپنی امیدوں، اپنی آرزوؤں اور اپنے خون جگر سے ایک ایک اینٹ چنتی جاتی ہوں۔ اور عمارت بلند ہوتی جاتی ہو...... بلند...... اور بلند۔

وہ جب بھی دوپہر میں لیٹتیں۔ بیٹھک کے اس کواڑ کو جس میں کوھمرے کا یہ نو تعمیر گھروندہ تھا، بند کروا دیتیں۔ مبادا کہیں ہوا کا تیز جھونکا آجائے۔ اس کے آگے وہ نہ سوچ سکتیں۔ انہیں وہم سا ہوتا۔

آج سے تین سال پہلے بھی وہ ایسی ہی ایک عمارت کی تعمیر میں مصروف تھیں۔ ان ہی

دنوں ان کے کمرے کے روشندان میں ایک چڑیا نے انڈے دیئے تھے۔ وہ چڑیا دن رات اپنے پروں کو پھیلائے انڈوں پر بیٹھی رہتی۔ اکثر دوپہر کو جب وہ اپنے پلنگ پر لیٹتیں تو چڑیا کو بڑی دلچسپی سے دیکھتیں۔ انہیں ایسا لگتا کہ وہ چڑیا ان کی رازداں ہو۔ اسے معلوم ہوا کہ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ایک جیسی عمارت کی تعمیر میں دونوں مصروف ہوں۔ چڑیا اپنی گول گول چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے انہیں تکتی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں ایک دوسرے کی عمارت کی سلامتی کی دعائیں دیتیں۔ ایک ایسی وابستگی انہیں اس چڑیا سے ہوگئی جیسے دو ہم پیشہ معماروں یا دو صنعت کاروں میں ہوتی ہے۔

لیکن ایک دن وہ عمارت جس کی تعمیر میں صرف چند دن باقی تھے زمین بوس ہوگئی اور آفتاب دلہن کو مردوں کی طرح بستر پر لٹا دیا گیا۔ اس ابتری میں بھی سب سے پہلے ان کی نظریں روشن دان پر پڑیں۔

''ارے'' وہاں نہ چڑیا تھی نہ اس کے انڈے۔ انہوں نے گھبرا کر فرش پر دیکھا۔ انڈوں کے چھلکے بہت ساری سفیدی، زردی فرش بالکل گندہ تھا۔ انہیں بڑا رنج ہوا۔

اس واقعے کو تین سال بیت گئے۔ وہ بنجر زمین کی طرح پڑی سوکھتی رہیں۔ انہیں ایسا لگتا کہ ایک عمارت کی تعمیر کے بعد ان کے ہاتھ قلم کر دیئے گئے ہوں۔ اب وہ کسی نئی تعمیر کے قابل نہیں ہیں۔

یوں ہی دن پہ دن بیتتے گئے۔ وہ مایوس ہونے لگیں کہ اچانک ان کی طبیعت خراب سی رہنے لگی اور جب ایک دن صفیہ پھوپھی نے انہیں بتایا کہ کوھمرہ ڈرائنگ روم کی چوکھٹ پر ایک گھروندہ بنا رہا ہے تو پھر انہیں یقین ہوگیا کہ وہ بھی ایک گھروندہ بنانے والی ہیں۔

کوھمرہ......کوھمرہ......انہیں یاد تھا کہ میکے میں جب چھوٹی تھیں۔ جب بھی کسی جگہ کوھمرہ گھروندہ بناتا، کبھی جوتے کے ڈبے پر، کبھی بھیا کی مسہری کے ڈنڈے پر، کبھی غسل خانہ کی دیوار پر، تو شادی شدہ بہنوں اور بھابیوں میں خوب چہلیں ہوتیں۔

''بھئی ہوشیار کوھمرے نے گھر بنایا ہے۔'' اور سب ہلکے ہلکے مسکراتیں۔

آج یہ کوھمرہ ان کے لئے گھر بنا رہا ہے۔ انہیں ایسا لگتا جیسے وہ ان کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ وہ اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتیں۔ اس میں خود ان کی سلامتی ہے۔ جب بھی آندھی آتی، جھکڑ چلتے وہ سارا کام بھول کر ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کرتیں۔ ملازموں کو پہلے ہی ہدایت کی جا چکی تھیں۔ آفتاب احمد اب اسٹڈی روم میں اپنے دوستوں سے ملتے۔ انہوں نے ڈرائنگ روم بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتے — ''ڈرائنگ روم اب انسانوں کے لئے نہیں مکڑیوں اور کوھمروں کی آماج گاہ بن چکا ہے۔''

لیکن اتنی ساری احتیاطوں کے باوجود...... ایک دن صفیہ پھوپھی ہکا بکا بڑی بیگم کے پاس آئیں۔ بھائی غضب ہو گیا۔ کارنس پر جو تصویر تھی وہ ہوا کے زور سے بیٹھک کی چوکھٹ پر گری اور کوھمرے کا گھروندہ اس کی زد میں آ رہا۔

بڑی بیگم نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آہستہ بولو صفیہ بیگم۔ مجھے خود ہی ہول آ رہی ہے۔ کہیں آفتاب دلہن نہ سن لیں۔ کہیں انہیں وہم نہ ہو جائے۔

لیکن یہ بات برآمدے سے باورچی خانہ کی طرف جاتی ہوئی آفتاب دلہن کے کانوں میں تیر کی طرح گھستی چلی گئی۔ ہاتھ میں میووں کا تشت تھا وہ زمین پر آ رہا اور اس کی سنبھالنے میں قدم ڈگمگائے تو...... پھر......

بروقت ڈاکٹروں کی امداد...... قیمتی دواؤں نے انہیں خطرے سے باہر نکال دیا۔ ان پر کوئی آنچ نہ آئی۔ نہ اُن کے گھروندے پر کوئی گزند پہنچی۔ لیکن اُس کو کیا کیا جائے۔ ان کے دل کا وہم نہ دور ہو سکا، ڈاکٹر سمجھاتے، آفتاب احمد منتیں کرتے، لیکن وہ صرف یہی کہے جاتیں۔

''جو میرے مقدر میں ہے اس کا فیصلہ ہو چکا۔ اب آپ لوگوں کے کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔'' یہ کہہ کے وہ یوں روئیں کہ آفتاب احمد کے ماتھے پر پسینے پھوٹ آئے۔ ڈاکٹر حیران تھے۔ سب کچھ اطمینان بخش ہونے کے باوجود انہیں یہ وہم کیوں ہو گیا، کسی بات کا اس حالت میں اتنا

یقین ہونا بھی تشویشناک ہے۔ جسم تو ذہن کا تابع ہوتا ہے۔ آفتاب احمد نے تنہائی میں بیوی کو سمجھانا چاہا۔

''بھئی تم مجھے بتاؤ کہ آخر تمہیں یہ وہم کیوں ہو گیا ہے۔'' ڈاکٹروں نے تو ہر طرح یقین دلایا ہے۔''

''نہیں، آپ نہیں سمجھتے، آفتاب دلہن نے مایوسی سے کہا۔ انہیں وہ چڑیا یاد آئی۔ جس کے انڈے فرش پر چکنا چور ہو گئے، اسی دن...... جس...... دن...... وہ بھی اپنی امیدوں...... اپنی آرزوؤں سے محروم ہو گئیں۔ اس بار بھی ویسا ہی ہوگا۔ کوھمرے کا گھروندہ ٹوٹ گیا...... میرے گھروندے کو بھی ٹوٹنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

''آخر مجھے بتانے میں کیا حرج ہے۔ ہو سکتا ہے۔ میں کچھ تمہاری مدد کر سکوں۔'' آفتاب احمد نے ان کی پریشانی پر پڑی ہوئی لٹ کو درست کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں آپ اس کو سمجھ نہیں سکتے۔''

''سمجھوں گا کیوں نہیں۔ نہیں سمجھوں گا تو دوسروں سے مدد لوں گا۔''

غرضکہ بڑی منتوں کے بعد آفتاب دلہن نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ ''وہ...... وہ...... کوھمرے نے گھر بنایا تھا۔ وہ آندھیوں کی زد میں آکر ٹوٹ گیا۔''

''تو کیا ہوا'' آفتاب احمد کچھ نہ سمجھے۔

''بھئی کوھمرے کا گھر اس بات کی علامت ہے کہ کوئی اُمید سے ہے، افسوس کہ میں پھر نہ سمجھا''۔

''دیکھئے، میں نہ کہتی تھی کہ آپ کچھ نہ سمجھیں گے...... اس گھروندے کو اس وقت تک نہیں ٹوٹنا چاہیئے تھا۔ جب تک......'' وہ جھجکنے لگیں۔

''لیکن یہ کوئی اپنے اختیار کی بات تو نہیں۔ مٹی کی چیز کی حقیقت ہی کیا ہے۔ اس سے اور آپ کی حالت سے کیا مناسبت''۔ آفتاب احمد کا دل چاہا کہ بیوی کا مذاق اُڑائیں۔ لیکن اس

وقت مناسب نہ سمجھ کر سمجھانے لگے۔

''بھئی یہ آپ کو وہم ہے اور وہم کا علاج لقمان جیسے حکیم کے پاس بھی نہیں۔ ان بیکار چیزوں پر اتنا اعتقاد۔ یہ کوئی سند تو نہیں۔ کسی کتاب میں تو آپ نے نہیں پڑھا'' وہ کیا جانیں کہ یہ اور ایسی بہت ساری باتیں عورتوں کی اپنی دنیا میں کسی سند، کسی کتابی نکتے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کے سر پھوڑنے کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ جھنجلائے جھنجلائے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور آفتاب دلہن کو بدستور وہم چاٹتا رہا۔ انہیں یقین تھا کہ کبھی اور کسی وقت بھی ان کی عمارت جس کی تکمیل میں چند ماہ ہی باقی تھے ٹوٹنے والی ہے۔ سوتے سوتے وہ چونک کر اٹھ بیٹھتیں۔ کبھی گھبرا کر کھڑی ہو جاتیں۔ کبھی اٹھ کر تیزی سے تنہائی کی طرف بڑھ جاتیں۔ ڈاکٹر نے بھی تشویشناک بتائی تھی۔

آج طبیعت بڑی گری گری سی لگ رہی تھی۔ آج انہیں یقین تھا کہ وہ ہو جائے گا جو ہونے والا ہے۔ گھر کے سبھی لوگ ان کے کمرے میں موجود تھے۔

آفتاب دلہن آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں۔ چہرے سے نقاہت برس رہی تھی۔ سبھی لوگ ان کی طرف سے فکرمند تھے۔

''دلہن ...... دیکھو...... ذرا اِدھر دیکھو'' صفیہ پھوپھی کی مسرت بھری چیخ نے سبھوں کو متوجہ کرلیا۔ وہ دیکھو، کوھمرے پھر دوسرا گھر بنا رہا ہے۔'' اور...... اور...... آفتاب دلہن کو ایسا لگا، جیسے ان کی عمارت کی گری ہوئی دیواروں کو کسی کے مضبوط ہاتھ نے تھام لیا ہو۔

☆☆

فسانۂ عبرت

جاوید! آج مدتوں بعد تم کو خط لکھ رہی ہوں۔ لیکن یہ خط کبھی تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ ضرورت ہی کیا ہے اسے تم تک پہنچنے کی۔ تم سے میرا کیا ناطہ؟ آخر مجھ سے تم سے رشتہ کیا ہے کہ میں تمہیں خط لکھوں۔ میرا رشتہ تو اس دن ٹوٹ گیا جاوید! جس دن تم نے اس سرزمین کو خیرباد کہا اور اپنے سارے رشتے، سارے تعلقات، ساری یادوں کو پیچھے چھوڑ دیا اور ایک اجنبی دیس کو یوں گلے لگایا جیسے وہی تمہارا سب کچھ ہے۔ میں تو شاید تمہاری یاد سے بھی پرے ہوگئی ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے بھی تمہاری ہر یاد، ہر عکس، ہر خلش کو دل سے یوں نکال پھینکا جیسے وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ تم چونکو نہیں۔ بھول جاؤ کہ عورت کی پہلی محبت اس کی آخری محبت ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ پہلی محبت جیسی گرمجوشی کسی کو نہ دے سکتی ہو لیکن اس کی پہلی محبت ایک لپکتا ہوا شعلہ ہو سکتی ہے۔ نفرت کی ایک آندھی بجھا بھی سکتی ہے۔ لیکن دوسری محبت ایک دبی دبی سے چنگاری ہوتی ہے جسے وفا و خلوص کی نرم ہوائیں ہلکے ہلکے لپکاتی رہتی ہے۔

جاوید! تم سوچو تو اگر میں تم سے نفرت کروں تو کیا میں حق بجانب نہیں ہوں، کیا تم نفرت کئے جانے کے قابل نہیں ہو۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کے دیکھو! تم حیران ہوگے کہ ایک الھڑ سی بے وقوف لڑکی کو اتنی باتیں بنانا کیسے آگئیں۔ وہ لڑکی جو احمقوں کی طرح صرف رونا جانتی ہو وہ ایسے

سوالات کیسے کر سکتی ہے بھلا۔ ہاں جاوید! تم مجھے احمق نہ سمجھتے تو اتنا بڑا فریب کیسے کرتے۔ تم سمجھتے تھے کہ یہ بیوقوف جو صرف زندگی محبت اور خلوص کی باتیں کرتی رہی ہے۔ وہ نفرت کیسے کر سکتی ہے۔

ہاں جاوید! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں بڑی بیوقوف تھی۔ لیکن اب نہیں ہوں۔ مجھے زندگی سے اتنی محبت تھی کہ ہر اس شئے سے جس سے کسی ذی روح کو کوئی ضرب پہنچنے کا امکان ہو، مجھے اس سے نفرت ہو جاتی تھی۔ نفرت؟ نفرت! نہیں جاوید نفرت تو مجھے کسی سے بھی نہیں تھی۔ نفرت سے بھی نہیں۔ میں نے تو دکھ سے بھی پیار کیا تھا۔ سکھ سے بھی۔ جبھی تو تم مجھے آدرش واد، گاندھی واد اور پتہ نہیں کیا کیا کہہ کر میرا مذاق اُڑاتے تھے۔ مجھے گھنٹوں بناتے۔ مجھے موت سے شدید نفرت تھی جاوید۔ شدید نفرت۔ میں پرندوں، کیڑے مکوڑوں کو بھی مرتے نہ دیکھ سکتی۔ تمہیں یاد ہوگا دوپہر کے وقت جب گھر کے سارے لوگ سو گئے تھے، تم میرے کمرے میں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ تم ان دنوں بڑی محنت کر رہے تھے۔ تمہارے امتحانات قریب تھے۔ میں تمہارے قریب بیٹھی تھی۔ پڑھتے پڑھتے تم نے نظریں اٹھائیں تھیں اور میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ تمہاری آنکھوں میں کچھ کچھ ایسی کشش تھی کہ میں نظریں نہ جھکا سکی۔ نگاہیں تمہاری نظروں میں ڈالے میں نے بے خیالی میں ٹیبل پر سے تنکا اٹھالیا اور اسے توڑنے لگی۔ ارے انگلیوں پر چپچپے پن کا احساس ہوا اور میں گھبرا گئی۔ کوئی ننھا سا پتنگا تھا جس کو میں نے انگلیوں سے مسل دیا تھا۔ اُف فوہ! میری کیا حالت ہوئی۔ ہائے۔ ہائے اللہ یہ میں نے کیا کیا۔ میں نے اس کی جان لے لی۔ ایسی بھی کیا بدحواسی، گرم گرم آنسوؤں کے قطرے میرے رخساروں سے پھسلتے ہوئے ٹیبل پر گرنے لگے۔ تم نے یہ دیکھا تو زبردست قہقہہ لگایا۔ بہت دیر تک ہنستے رہے۔ تم نے میری چڑھ مقرر کر لی۔ ہمیشہ مجھے چڑھاتے اور ستیہ وادی، اہنسا وادی اور پتہ نہیں کیا کیا کہتے۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں تو کسی چھپکلی کو بھی، کسی پتنگے کے پیچھے دوڑتے دیکھتی تو میرا دل دھڑکنے لگتا۔ یا اللہ اب کیا ہوگا۔ وہ ننھے سے پتنگے کو ضرور نگل لے گی۔ مجھے چھپکلی سے نفرت سی ہو جاتی۔ جب تک بھگا نہ لیتی سکوں نہ ہوتا۔ تم مجھے جب چھپکلی کے پیچھے ڈنڈا اٹھائے بھاگتے دیکھتے تو سچ مچ مجھے دنیا

کی سب سے احمق لڑکی تصور کرتے اور......اور......ایک بار جاوید! ایک اَدھ موئے چونٹے کو چونٹیوں نے مردہ سمجھ کے گھسیٹنا شروع کیا تا کہ اسے اپنے گھر کے ننھے سے دروازے تک لے جائے، تم نے مجھے چیلنج کیا تھا کہ اب بچاؤ اس کی جان۔ دیکھیں کیسے بچاتی ہو۔ میں نے پنسل کی نوک سے انہیں جدا کرنا چاہا۔ تم یہ دیکھ کر ہنس پڑے۔ اہا، اس طرح تو دونوں کی جان لوگی۔ میں بہت گھبرائی۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ اب چونٹی کو سوراخ میں گھسنے سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا تو میں نے گھبرا کر ان دونوں کے درمیان پنسل کی نوک رکھ دی۔ دونوں میری پنسل سے کچل گئے۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ اس وقت......اس وقت پہلی بار مجھے تمہارے بلند بانگ قہقہے سے نفرت ہوگئی۔ ہاں! مجھے زندگی میں پہلی بار تم سے نفرت سی ہوئی۔

تم نے کہا تھا۔ واہ خوب! تم نے ہی ان کا خون کر دیا۔ ہاں جاوید! کبھی کبھی زندگی سے اتنی محبت کرنے والا ہی زندگی کا گلا گھونٹ دیتا ہے، اسے زہر پلا دیتا ہے۔ تم مجھے کہا کرتے تھے کہ "شمی پاگل نہ بنو۔ کیوں ان چھپکلیوں اور چونٹیوں کے پیچھے پڑی ہو۔ ایک کی بقا کے لئے دوسرے کی فنا لازم ہے۔

ہاں جاوید! تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے بھی وہی کیا۔ میں نے بھی ایک زندگی کی بقا کے لئے دوسری کو زہر پلانا چاہا۔ ہاں میں نے خود اسے زہر پلایا تھا۔ اپنے ہاتھوں! تم یقین نہ کرو گے۔ اپنے بچّے کو اپنے جگر گوشے کو! کیوں؟ تم پوچھتے ہو کیوں؟ کیا یہ بھی تمہیں بتانا پڑے گا۔ تم نے شاید یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میرے ہی ہاتھوں میرے بچّے کا خون کراؤ گے۔ تمہیں میرے "اہنساواد" ہونے سے نفرت جو تھی۔ ہاں جاوید! اب مجھ سے بھی نفرت ہوگئی۔ سب سے، اپنے آپ سے بھی ہوئی۔ ان دنوں میری زندگی میں صرف نفرت ہی نفرت تھی۔ زندگی سے کوئی محبت نہیں تھی۔ میں چھپکلی کے جبڑے میں ننھے سے پتنگے کو پھڑکتے دیکھتی، ٹس سے مس نہ ہوتی۔ بلکہ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں بے خیالی میں مسکرائے جاتی ہوں۔ زندہ چونٹا میرے سامنے سے چونٹیاں گھسیٹ لے جاتا اور میں اس وقت تک اسے دیکھتی رہتی جب تک وہ اسے بل میں نہ پہنچا دیتا۔

تمہیں یاد ہے جاوید، ایک بار تم نے میرے سامنے فوج میں بھرتی ہونے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ میں چیخ پڑی تھی۔ میں سخت مخالف تھی۔ تم نے سمجھا تھا کہ میں عام عورتوں کی طرح تمہاری زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ شمی کیا تمہیں اس پر یقین نہیں ہے کہ موت کا وقت معین ہے۔ اگر اس کا وقت آپہنچا ہے تو میں میدان جنگ میں رہوں یا تمہارے پاس، اس مکان کی چہار دیواری کے اندر رہوں مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں نے کہا تھا نہیں جاوید مجھے خود اس پر پورا یقین ہے۔ مجھے اس کے لئے کوئی تشویش نہیں۔ لیکن تم ...... تم کسی کی جان لوگے۔ تمہاری گولیاں کسی کا سینہ چھید دیں گی۔ کسی کے بازو اکھڑ جائیں گے۔ کوئی اپاہج ہو جائے گا۔ نہیں! نہیں!! جاوید میں یہ برداشت نہیں کرسکتی۔ دو گز زمین کے ٹکڑوں کے لئے جو میری ہے، نہ تمہاری۔ تم اتنے مظلوموں کے خون سے دامن رنگ لوگے۔ نہیں! جارہے ہو تو ہمیشہ کے لئے جاؤ۔ پھر کبھی میرا منہ نہ دیکھنا۔

تم حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔ پھر تم نے کبھی فوج میں جانے کا نام نہیں لیا۔ لیکن جاوید ان دنوں میری جو ذہنی کیفیت تھی کہ میں تمہارے ہاتھوں میں رائفل تھما دیتی کہ جاوید میرے سورما! جاؤ! جب تک کسی کو اپنی گولیوں کا نشانہ نہ بنالینا خود نہ مرنا۔ جب تک کسی کی مانگ نہ اجاڑ لینا میری مانگ نہ اجاڑنا۔ جب تک کسی بچے سے اس کے باپ کا پیار نہ چھین لینا اپنے بچے کو یتیم نہ بنانا۔

ہاں جاوید! تمہارا ہی بچہ تو تھا۔ وہ جسے میں نے! میں جو اس کی ماں تھی زہر کا گھونٹ پلا دینا چاہا تھا۔ میں اسے جننے سے پہلے گاڑ دینا چاہتی تھی۔ میں پاگل ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے ہوش کھو دیئے تھے۔ تم نے اپنی امانت مجھے سونپ کے ایک اجنبی دیس کو اپنا وطن بنا لیا۔ ٹھیک ہی کیا تم نے۔ اس دیس میں کوئی تمہیں یہ یاد تو نہ دلاتا ہوگا کہ تم دور بہت دور ایک معصوم سی بے وقوف لڑکی کی گود میں دنیا کی ساری بدنامی و رسوائی ڈال کر چلے آئے ہو۔

جاوید میں کیا کرتی! میں کیا کرتی۔ مجھ سے کچھ نہ بن پڑا تو میں تم سے نفرت کرنے لگی۔

زندگی سے نفرت کرنے لگی۔ میں نے انسانیت کا گلا گھونٹنا چاہا۔لیکن ایک فرشتے نے میرا ہاتھ تھام لیا۔اس نے بڑھ کے مجھے روک لیا۔ وہ عظمت اور نور کا مینار تھا۔ جس نے اپنے قریب کی ساری تاریکیوں کا سینہ چیر دیا تھا۔ ہاں جاوید وہ عظمت کا مینار محمود تھا۔ وہ خاموش سا لڑکا، متین و سنجیدہ سا، تمہیں تو یاد بھی ہوگا۔ وہ مجھے، اکثر ایسی نظروں سے دیکھتا کہ تم جلدی جلدی کھنکارنے لگتے۔کبھی کبھی جلدی جلدی اُسے باتوں میں لگا لیتے تا کہ اس کی توجہ ہٹ جائے۔ وہ امّی کا بھانجا تھا۔تم اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔

ہاں تو جاوید ان دنوں مجھ پر خون سوار تھا۔ میری نگاہیں کسی قاتل کی نگاہوں سے مشابہ لگتیں۔ میں جب کبھی آئینے میں کھڑی ہوتی تو اپنی نگاہوں سے ڈر جاتی۔ انہیں دنوں...... انہی دنوں محمود نے امّی سے مجھے مانگا۔ میں نے یہ سنا تو میں پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ ایسی چیخیں جسے صرف تم سن سکتے تھے یا میں۔ لیکن نہیں شاہد محمود نے بھی یہ چیخ سن لی تھی۔ کیونکہ وہ...... وہ میرے کمرے میں چلے آئے۔ میں نے انہیں دیکھا تو مجھ پر وحشت سوار ہوگئی۔ میں نے ان سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو مجھے نہ کہنا چاہیئے۔ میں نے یہ کہہ دیا کہ میں قاتل ہوں۔ میں خونی ہوں۔ میں نے خون کیا۔ ہاں اپنے بچے کا خون، اپنے جگر گوشے کا خون! جاؤ محمود، چلے جاؤ، ابھی چلے جاؤ، کاش دنیا کی کوئی عدالت مجھے سزا دیتی تو شاید میں پُرسکون ہو جاتی۔ میرا ضمیر مطمئن ہو جاتا۔ میں اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتی۔ میں نے محمود سے کہا کہ میں نے آج خون کیا ہے۔ میں نے آج اپنے بچے کو مارنے کے لئے دوا کھائی ہے۔

جانتے ہو جاوید! محمود نے کیا کیا۔ نہ وہ بھاگا نہ گھبرایا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ شمی یہ تم نے کیا کیا۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں تھا۔ کیا انسانیت پر سے تمہارا اعتماد اتنا اٹھ گیا ہے۔ کیا میں اتنا گرا ہوا ہوں کہ ایک انسان کے بچے کو سینے سے نہ لگا سکوں۔ کیا جاوید کا بچہ میرا بچہ نہیں ہوسکتا۔ شمی یہ تم نے کیا کیا۔ میں تو سب جانتا تھا۔ اسی لئے میں نے اتنی عجلت کی تھی۔ شمی مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ تم جو زندگی سے اتنی محبت کرتی ہو کہ ہر کسی ذی روح کی موت سے یوں تڑپ جاتی ہو۔

اپنے بچے کا خون کر دو گی۔ نہیں...... میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ وہ مجھے جھنجھوڑے جا رہے تھے پاگلوں کی طرح۔ آنکھیں سرخ تھیں، بال پیشانی پر بکھر گئے تھے۔ مجھے بھی اچانک ہوش آ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں انسانیت کے عمیق غار میں پڑی ہوئی ہوں۔ اندھیرا ہے، تاریکی ہے۔ روشنی کا کہیں نام نشان بھی نہیں۔

محمود...... وہ تو فضا کی بلندیوں میں پرواز کر رہا ہے۔ دونوں بازو پھیلائے اور اس کے آگے ہمکتا ہوا ایک بچہ ہے۔ ایک انسان کا بچہ۔ اس کا یا کسی اور کا۔ پیارا سا گول مٹول سا۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ پھیلائے ہوا اس کی گود میں آ رہا ہو اور محمود کا چہرہ...... اس بچے کا چہرہ۔ جاوید! ان چہروں میں کوئی فرق نہ تھا۔ بالکل معصوم فرشتوں جیسا چہرہ۔ ہاں جاوید! تمہارا بچہ! نہیں نہیں!! وہ تمہارا بچہ کیوں ہونے لگا۔ وہ محمود کا بچہ ہے، بالکل محمود جیسا، لوگ کہتے ہیں کہ باپ بیٹے میں اتنی مشابہت آج تک نہیں دیکھی، جاوید میں خود سوچتی ہوں کہ وہی تو اس کا باپ ہے۔ تم نے تو مجھے یہ کہہ کر کہ ایک زندگی کی بقا کے لئے دوسری زندگی کی فنا لازمی ہے میرے ہاتھوں میں زہر کی شیشی تھما دی تھی۔ میں نے اسے نگل لیا تھا۔ لیکن محمود نے اسے حلق میں انگلی ڈال کر نکال لیا۔ بتاؤ کون اس کا باپ ہے۔ وہ یا تم؟ اس کی انسانیت اور شرافت دیکھو کہ اس دیوار کو جسے تم نے ڈھانا چاہا تھا اپنی مضبوط پشت پر سنبھال لیا۔

آج وہ بچہ محمود سے اتنی محبت کرتا ہے کہ تم دیکھو گے تو رشک سے جل مرو گے۔ جس طرح کوئی عشق الٰہی سے سرشار خانہ کعبہ کا طواف کرے بالکل اسی طرح وہ محمود کے گرد چکر لگاتا ہے۔ انہی کے ساتھ کھاتا ہے۔ انہی کے ساتھ سوتا ہے، وہ مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتا۔ اسے کرنا بھی نہیں چاہئے۔ میں اس کی ماں کہاں ہوں۔ میں نے اسے مار ڈالنا چاہا تھا۔ جاوید! محمود کی بچی میری گود میں ہے۔ ہاں! جاوید، مجھے بڑی مسرت و فخر کا احساس ہوتا ہے۔ جب میں سوچتی ہوں کہ اتنے عظیم انسان کے بچے کی ماں ہوں۔ میں چاہتی ہوں جاوید! کہ وہ بچی مجھے اتنا ہی چاہے جتنا محمود کو چاہے۔ لیکن محمود مجھ پر ہنستے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ یہ بھی مجھے تم سے

زیادہ چاہے گی۔

اور میں سوچتی ہوں کہ شاید ایسا ہی ہو۔ میں نے ممتا کو داغدار کیا ہے۔ میں ماں ہی کہاں رہی۔ بھلا کوئی ماں بھی اپنے بچے کو زہر دے سکتی ہے۔

اور......اور......وہ تو ازلی باپ ہے۔ ساری دنیا کا باپ، عالم انسانیت کا باپ!

لیکن جاوید! میں محمود سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ میرا دعویٰ ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی عورت اپنے شوہر کو اتنا چاہتی ہوگی۔ محمود کو چاہنے سے تو کوئی جذبہ مجھے روک نہیں سکتا۔ بلا سے میرے بچے میرے نہ ہوں۔ بس محمود صرف محمود میرے ہیں۔

میں پہلے بیوی ہوں..........بعد میں ماں ہوں۔

☆☆

دل ایک کعبہ

بہت سارے شہنشاہ رچرڈ قبرستان کا پھاٹک پکڑے کھڑے تھے۔ یہ جنازہ ایک طوائف کا جنازہ ہے۔ اسے اس قبرستان میں جہاں کئی نیک ارواحیں بھی ہیں، دفنایا نہیں جاسکتا۔

سنتے ہیں کہ دل ٹوٹتا ہے تو ایک کعبہ مسمار ہوتا ہے۔ اگر روح کو احساس کی دنیا سے کوئی تعلق ہے اور دل نام کی کوئی شئے بھی اس میں موجود ہے تو آج ایک کعبہ مسمار ہوگیا اور اتنے سارے رچرڈس کے درمیان سلطان صلاح الدین ایوبی کوئی نہیں تھا جو اسے مسمار ہونے سے بچا لیتا کیونکہ یہ دل روشن بائی طواف کا ہو یا سعیدہ باجی جیسی بی بیوں کا۔

ع دل ہی تھا نا، کوئی پتھر تو نہیں تھا

روشن بائی کا دل بھی خانہ کعبہ تھا جو کوئے یار میں دو گز زمین نہ ملنے پر مسمار ہوگیا اور سعیدہ باجی ایک نیک بی بی تھیں اس لئے انہیں عزت واحترام کے ساتھ پھاٹک کے اندر داخل کیا گیا۔

قضا نے دونوں کو ساتھ بلایا۔ لیکن انسانوں نے کتنی دوئی برتی۔ ایک کو قبرستان کے باہر

پس دیوار دفنایا جانے لگا اور ایک کا ڈولا بصد عزت واحترام اندر لایا گیا۔

کون جانے کون کس جگہ کے لائق تھا۔

ہم تو دونوں کو جانتے ہیں۔ آمنے سامنے دونوں کا مکان تھا۔ کہتے ہیں کہ دونوں کے باپ دادا کی نال اسی محلے میں گڑی تھی۔ جتنا پرانا سعیدہ باجی کا آنگن تھا شاید اتنا ہی پرانا روشن بائی کا کوٹھا تھا۔ سعیدہ باجی کے آنگن سے روشن بائی کا کوٹھا صاف جھلکتا۔

رات کو روشن بائی کا کوٹھا آباد ہوتا تو سعیدہ باجی کو دھڑکن ہونے لگتی۔ گھونگروؤں کے ساز اور طبلے کی ہر تھاپ پر وہ استغفار پڑھتیں۔ کبھی ناگاہ کوٹھے پر نظر پڑ جاتی تو جلدی سے نگاہیں پھیر کے تھوک دیتیں۔ بڑی دیر تک منہ ہی منہ بڑبڑاتی رہتیں۔

کہاں گئی، لوگوں کی شرافت۔ ایک طوائف کلیجے پر مونگ دلنے کو موجود۔ رحمت کے فرشتے کیا آئیں گے ادھر یہاں تو ہر گھڑی چھما چھم کی آواز آتی رہتی ہے۔

سعیدہ باجی کب بیوہ ہوئیں یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس ہم نے سنا تھا کہ ان کے شوہر بینک میں ان کے نام پر بہت سے روپے چھوڑ کر مرے ہیں۔ جس کا سود یہ ہر سال نکالتی رہتی ہیں اور اسی سے سال بھر کسی نہ کسی طرح گذارہ کرتی ہیں۔

ویسے انہیں گھر سے مطلب بھی کیا تھا۔ صبح اٹھتیں اور ایک پیالہ چائے پی کر اپنا برقعہ اٹھاتیں جو سر سے پیر تک ایک تھا۔ وہ بُرقعہ کا اگلا حصہ اٹھا کر سر پر رکھ لیتیں۔ اس طرح چہرہ ان کا ہر کوئی دیکھتا۔ پشت کی طرف سے پردہ پوشی ہوتی اور وہ سارے محلے کی خبر لے آتیں۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہر ایک آنگن میں نفرت کی ایک بیج ڈال آتیں۔ جہاں زمین زرخیز پاتیں وہ مسلسل آبیاری کرتی رہتیں اور جہاں سخت پاتیں وہاں آیندہ بارش کا انتظار کرتیں۔

انہوں نے کتنی سلماؤں کی آہیں سمیٹیں۔ کتنی آنگنوں میں دیوار بن گئیں۔ کتنے سروں پر تلوار بن کر چمکیں۔ ابھی کل کی تو بات ہے۔ بیچارے رشید ملا کی لڑکی شام کو چھوٹے سے آنگن کے حبس سے گھبرا کر چھت پر چڑھ گئی۔ چھت پر جھکے نیم کے پیڑ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔ کھلا صاف

آسمان، وہ ذرا دیر کو چھت پر رک گئی۔ ناگاہ اس کی نظر نیم کی اس شاخ پر پڑی جس پر ایک پتنگ کانپ رہی تھی۔ شاید نیچے سے کوئی اس کی ڈور کو کھینچ رہا تھا۔ کون بڑی عمر کی تھی کہ اونچ نیچ دیکھتی۔ دل بچوں کی طرح اچھلا۔ جھٹ سے گردن نکال کر نیچے دیکھنے لگیں۔ نیچے اپنے میدان میں ماسٹر احسان کا لڑکا حمید ڈور پکڑے کھڑا تھا۔ نظر جو ملی تو اس نے جلدی سے سر نیچے کھینچ لیا اور حمید مسکرا دیا۔ کسی نے دیکھا بھی۔

لیکن کوئی اور دیکھے نہ دیکھے۔ جسے دیکھنا نہیں چاہئے تھا اس کی ہزار آنکھیں بن گئیں۔ اپنے مکان کی طرف جاتی ہوئی سعیدہ باجی نے دیکھ لیا اور راستے میں سے گھوم گئیں۔ جب تک سلمٰی چھت سے اترتی تب تک کئی گھروں میں اس کے چرچے ہو گئے۔

ملّانی بی دھک سے رہ گئیں۔ رشید ملّا شرم سے مغرب کی نماز پڑھانے مسجد نہیں گئے۔ سلمٰی کو کمرے میں لے جا بی ملّانی نے کئی ٹھوکے دیئے۔

''اری نیک بخت! ایک تجھے ہی دنیا کی گرمی چڑھی ہے جو ہوا کھانے کو چھت پر چڑھ گئی۔ یہی لچھن رہے تو دوزخ کی گرمی کیسے برداشت کرو گی، بی بنو'' اور سلمٰی کچھ نہ سمجھ سکی، تو رونے لگی۔ ملّانی کا غصہ دھیما نہ ہوا اور باوا کو کیا کہو گی، جو منہ چھپائے گھر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ مسجد سے روٹی بندھی ہے۔ اگر مسجد نہیں جاتے تو جہنم کیسے بجھے۔'' سلمٰی کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں۔

بات کچھ بھی نہیں تھی۔ لیکن غریب کی عزت دو جملے میں اتر گئی۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ ملا صاحب نماز پڑھانے نہیں گئے۔ لوگوں نے معاملے کو سنگین سمجھا۔ استفسار ہی استفسار میں جو نہ جانتے تھے انہیں بھی خبر ہو گئی۔

یہ سب کچھ تھا لیکن اگر ملا صاحب جلد بازی نہ کرتے تو بات کا کیا تھا۔ ہفتے عشرے میں دب ہی جاتی۔ لیکن انہوں نے جھٹ پٹ سلمٰی کے لئے حاجی صاحب کے یہاں حامی بھر دی۔ حاجی صاحب رنڈوے تھے۔ عمر بھی خاصی تھی۔ بہت دنوں سے سلمٰی کے خواہشمند تھے۔ لیکن ملا صاحب ان کی عمر دیکھ کر خاموش ہو جاتے۔ آج اس رسوائی نے ان سے منظوری لے ہی لیا اور

سلمیٰ کی شادی تک بات دب چکی تھی۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔

بات کچھ ہو یا نہ ہو سلمیٰ کا خون سعیدہ باجی کی گردن پر ضرور رہا۔ یہی خون کیا، ایسے ہزاروں خون سے ان کے ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔

بات تو آئی گئی ہوگئی۔ لیکن سلمیٰ کے بڈھے شوہر کو دیکھ کر ملانی جی کے دل کا زخم ہمیشہ رِستا رہا۔ وہ اپنی بیٹی کی جوانی دیکھتیں اور حاجی صاحب کی جھکی کمر دیکھتیں تو ملاّ صاحب کی زبان کی دہائی دیتیں۔ وہ کون سی ساعت میں زبان ہارے۔ وہ کیا جانیں کہ یہ زبان تو اُن کی بہن سعیدہ باجی کی ہے جس کا زخم تڑپاتا ہے مارتا نہیں ہے۔ کہتے ہیں نا کہ

چھری کا، تیر کا، تلوار کا تو زخم بھرا　　　لگا جو زخم زباں کا رہا ہمیشہ ہرا

آج کل سعیدہ باجی، فیروز کی والدہ کے یہاں اپنی زبان کا پھل دکھا رہی تھیں ——

ایک دن ہوا یوں کہ یہ یونہی ملنے ملانے کو فیروز کے آنگن میں جھانک آئیں۔ دیکھا کہ نئی نویلی بہو پلنگ پر بیٹھی ہے اور فیروز کی والدہ باورچی خانے میں پیاز کتر رہی ہیں۔ بس انہیں سنہری موقع ہاتھ لگا۔ انہوں نے الٹ کے اس پیاری سی گڑیا سی بہو کی طرف نہیں دیکھا جس کی معصومیت و بھولے پن پر ہر ایک کو پیار آتا۔ وہ جھٹ سے پلنگ سے اٹھیں اور باورچی خانے میں پہنچیں۔

"اے آپا! لائیے میں پیاز کتر دوں۔ اب کیا اس عمر میں بھی آپ کو چولہا ہی پھونکنا ہوگا۔" پھر ذرا دیر دھیمے لہجے میں بولیں۔ کیا اسی دن کو بہو لایا تھا کہ وہ پلنگ چڑھی بیٹھی رہے اور آپ نوکرانی بن کر باورچی خانے میں جتی رہیں۔

"ارے نہیں! ابھی اسے آئے ہی کتنے دن ہوئے۔ ابھی تو میں خود کردوں۔ آج نہ کل کرے گی ہی۔" فیروز کی والدہ نے جلدی سے بات کاٹی۔

نہیں آپا! یہ آپ کی بھول ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ جمتا بچہ اور نئی بیاہتا دلہن جس راہ دکھاؤ اسی راہ چلتے ہیں۔ ابھی سے اگر آپ نے اسے گھر کی ذمہ داری نہیں سونپی تو پھر کبھی نہیں لے گی۔"

فیروز کی والدہ خاموش ہو رہیں اور زمین زرخیز دیکھ کر سعیدہ باجی نے باقی آئندہ کے لئے رکھا اور دوسری باتیں کرنے لگیں۔

اور زمین سچ مچ زرخیز تھی۔ اوّل تو فیروز اکلوتے بیٹے تھے۔ ہر بیٹے کے بیاہ کے بعد ماں پر ایک تاثر رہتا ہے۔ ماں بیٹے کے رشتے کے درمیان ایک تیسرا وجود بھی آ جاتا ہے۔ ظاہر ہے شروع میں ہم آہنگی دشوار ہوتی ہے۔ ایسے میں لوہا گرم تھا۔ سعیدہ باجی ضربوں پر ضربیں لگاتیں گئیں۔ لگاتار کئی دن مسلسل ایک ہی بات سنتے سنتے ایک روز فیروز کی والدہ بیٹے بہو کا کھانا کمرے میں بھجوا کر منہ میں بڑبڑانے لگیں۔ ''اچھی نوکرانی ملی ہے مفت کا کھانا پکا پکا کر کمرے میں پہنچاتی رہتی ہے۔''

نئی بہو نے یہ سنا تو شرمندہ سی ہو گئی۔ سارا قصور اپنا ٹھہرایا۔ واقعی ساس کولہو کا بیل بنی رہے اور میں پلنگ پر بیٹھی رہوں۔ دوسرے دن پو پھٹنے سے پہلے ہی اٹھ بیٹھی۔ جھانک کے دیکھا تو ساس سوئی تھیں۔ پانی گرم کر کے وضو کا رکھا، چولہا جلایا۔ جلدی جلدی ناشتہ بنانے بیٹھ گئی۔ ساس اٹھیں تو جی باغ باغ ہو گیا اور انہیں کیا چاہیئے۔ بس بہو گھر سنبھال لے۔ ابھی تو وہ اتنی جلدی باورچی خانے میں جانے بھی نہ دیتیں۔ لیکن دنیا والے بھی تو انگلی اٹھانے لگے۔

منہ دھویا۔ بہو نے جلدی جلدی تخت پر ناشتہ لگایا۔ ماں بیٹے اور بہو نے مل کے ساتھ ساتھ ناشتہ کیا۔ پھر ساس تسبیح لے کر تخت پر جا بیٹھیں اور ڈھیروں دعائیں بہو کو دینے لگیں۔ ہفتہ گذر گیا کہ ایک دن اپنے ڈالے ہوئے بیج کی کونپلیں دیکھنے سعیدہ باجی پھر آ دھمکیں۔ بہو کو باورچی خانے میں اور ساس کو تسبیح لئے تخت پر بیٹھا دیکھا تو آنکھیں چمک گئیں۔ سیدھی تخت پر آ کر بیٹھ گئیں۔ تسبیح چوم کر فیروز کی والدہ نے جانماز پر رکھ دی اور سعیدہ باجی سے بہو کی تعریف کرنے لگیں۔ بھلا سعیدہ باجی کو کیا بھاتیں یہ باتیں۔ جس بات سے پیار و محبت کی خوشبو آئے، جس آنگن میں پیار و محبت کے شگوفے کھلیں وہاں سعیدہ باجی کا کیا من لگتا۔ وہ گھوم پھر کے پھر حرف مطلب پر آئیں۔

''لیکن آپا! ایک بات کہوں۔ یوں بے اختیار بھی نہ بن جایئے۔ سارا اختیار بہو کو دے کر تو آپ اپنے ہاتھ کاٹ لیں گی۔ پیسے کی ضرورت ہوگی تو بہو کے آگے ہاتھ پسارو۔ نہیں آپا! میں نے تو بہت گھروں میں دیکھا ہے کہ پہلے تو لاڈ میں آ کر ساسوں نے بہوؤں کو اختیار دیدیا اور پھر جب ضرورت ہوئی تو بہو کے آگے ہاتھ پسار دیا۔ کنجی تو آپ اپنے ہی پاس رکھیئے۔

چھوڑو سعیدہ مجھے پیسوں کی کیا ضرورت۔ میری کیا کوئی اور دوسری اولاد ہے۔ میرا بھی سب ان ہی کا ہے۔ میرے فیروز نے ساری کمائی میرے آگے رکھ دی۔ میں نے اٹھا کے بہو کو یدی۔ میں تو بس اب یہ چاہتی ہوں کہ بہو گھر دیکھے اور میں اللہ اللہ کروں۔

نہیں! نہیں!! ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا۔ میں آپ کو آگاہ کئے دیتی ہوں کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو پچھتایئے گا۔''

فیروز کی والدہ خاموش ہو رہیں اور سعیدہ باجی اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے چلی گئیں۔ دوسرے دن پھر آئیں۔ اتفاق کی بات اسی وقت بھنگن آ گئی۔ کب کے پیسے باقی تھے۔ تقاضا کرنے کو کھڑی ہو گئی۔ فیروز کی والدہ نے پکار کے بہو کو کہا۔ بہو ذرا بھنگن کو چونی دیدینا۔ اگلے ماہ کی باقی ہے۔

بس سعیدہ باجی کو پھر تو موقع ہاتھ لگ گیا۔ ''دیکھئے آپا چار پیسے کی بھی آپ نہ رہیں۔ اب بھی ہوش میں آیئے۔ ورنہ بعد میں جب دلہن سب پر حاوی ہو جائے گی تو پھر کون چھوڑتا ہے اپنا قبضہ واختیار۔''

فیروز کی والدہ آج سچ مچ چونی نہ دینے پر شرمندہ تھیں۔ خاموش ہو رہیں اور شاید خاموش ہی رہتیں، لیکن رات فیروز آئے تو ماں کے سامنے ذرا کھل کر بیوی سے ہنس بول دیئے۔

بھئی بیوی سے ہنسنے بولنے کے لئے ماں منع نہیں کرتی ہے۔ آخر وہ بہو لائی کس کے لئے، بیٹے ہی کی خوشی کے لئے نا۔ لیکن بیٹے کو ذرا احتیاط رکھنا چاہیئے کہ ماں کے سامنے وہ صرف بیٹا رہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسرا نہ آئے۔ بیوی تو ہے ہی رفیق حیات اس سے کسے انکار۔

فیروز کی والدہ کے دل میں ایک کسک اُٹھی ۔ نئے رشتے تھے۔ ابھی وہ عادی بھی تو نہیں تھیں ۔ پھر جب دل میں کسک اٹھی تو سعیدہ باجی کی ساری باتیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ ''ٹھیک کہتی ہے سعیدہ، ایسے تو میں بے دخل ہو جاؤں گی ۔ اپنے ہی گھر میں لوگ کہتے ہیں نا کہ جس کے ہاتھوں میں ہانڈی ڈوئی اس کے ہاتھوں میں سب کوئی ۔کل سے میں باورچی خانہ دیکھوں گی ۔

منہ اندھیرے وہ اُٹھ بیٹھیں ۔ بہو باورچی خانے آئی تو ہٹا دیا۔ ''تم جا کے دوسرا کام دیکھو، میں باورچی خانہ سنبھال لوں گی اور معصوم سی دلہن نے حیرت سے دیکھا اور چپ چاپ دوسرے کاموں میں لگ گئی۔ اس طرح نت نئے شگوفے سعیدہ باجی کھلاتی رہیں۔

دبی دبی چنگاریوں کو زبان کی ہوا دیتی رہیں۔ اب اکثر ماں بیٹے میں شکر رنجی ہو جاتی اور جب بیٹے سے دل بُرا ہوا تو بہو کیا اچھی لگے گی اور بہو ان نت نئی الجھنوں سے پریشان ہو گئی۔ اس کے عارض کے گلاب مرجھانے لگے ۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں پژمردہ ہو گئیں ۔ گھر کی یاد آئی ۔ پہروں روئی ۔ ایک دن ساس نے آنسو دیکھ لئے ۔ دل پسیج گیا ۔ دل کی بری تو تھیں نہیں ۔ بس دوسرے کے چڑھانے میں آ گئی تھیں ۔ وجہ پوچھی تو بہو پھوٹ پڑی ۔ وعدہ کیا کہ میکے ضرور بھیج دیں گے ۔ بہو کا دل بھی ساس کی شفقت پر صاف ہو گیا ۔ دراصل دل صاف تھا ہی ۔

لیکن شامت اعمال اسی دن سعیدہ باجی آ دھمکیں ۔ سنا تو ناک پر انگلی رکھ کے بولیں ۔ ''اوہو! جب ہی تو میں کہوں کہ بہو کا دل گھر داری میں کیوں نہیں لگتا کہتے ہیں کہ جب تک میکے کی یاد دل میں باقی رہے گی سسرال کو بہو اپنا گھر نہیں سمجھے گی ۔ اسی لئے تو ہمارے زمانے میں دلہن جیسے ہی سسرال میں قدم رکھتی تھی اسے سِل پر بٹھا دیا جاتا تھا تاکہ ماں باپ کی طرف سے دل پتھر ہو جائے ۔''

اس دن فیروز کی والدہ نے بالکل سنی ان سنی کر دی ۔ بلکہ انہیں برا معلوم ہوا ۔ کسی کو جواب دینے کی عادت نہیں تھی جو جواب دے بیٹھتیں ۔ دوسرے دن بہو کو میکے بھیج دیا ۔ فیروز بھی شادی کے دوسرے ہی بار سسرال گئے تھے ۔ بجائے چار دن کے دس دن رہ گئے ۔ ماں کا دل تھا ۔

بیٹے کی اتنے دنوں کی جدائی ذرا دل کو لگ گئی اور اِدھر سعیدہ باجی اپنی ڈور سخت کیے جا رہی تھیں۔ لیکن پکی شکاری تھی خوب سمجھتی تھی کہ کب پنچھی پوری طرح ان کے دام میں آئے گا۔ انہوں نے فوراً تاڑ لیا۔

”آپا! میں تو کہوں کہ اس بار دلہن آئیں تو میکے سے خط و کتابت بند کرا دیجئے گا۔ جب تک یہ خط و کتاب کا سلسلہ چلتا رہے گا نہ بیٹا آپ کا رہے گا نہ بہو آپ کی ہوگی۔“

”لیکن بھئی خط و کتاب میں کیسے بند کر سکتی بھلا۔ بس باہر ہی باہر خط اُڑوا دیجئے۔ تو نہ ان کا خط انہیں ملے گا۔ نہ اِدھر کا خط اُدھر جائے۔ اس طرح سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔“

پتہ نہیں سعیدہ باجی کو کسی کو ایذا دینے میں کیا ملتا۔ آخر وہ ننھی بہو سے کس وقت کی دشمنی نکال رہی تھیں۔ ایسی پیاری معصوم سی ہستی نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔ اس کی بھولی بھالی صورت پر تو غیروں کو بھی پیار آ جاتا۔

شاید ایذا رسانی بھی کسی کی فطرت بن جاتی ہے اور جب فیروز دلہن کے ساتھ آئے تو والدہ نے کہا کہ ”کیوں بیٹا اس دنیا میں بیوی کے سوا کوئی نہیں ہے تمہارا۔ یہ نہ سوچا کہ بوڑھی ماں انتظار میں سوکھ رہی ہوگی۔“

فیروز جھینپ گئے۔ ان سے واقعی غلطی ہوئی تھی۔ معافی مانگ لیتے تو بات آئی گئی ہو جاتی۔ لیکن کبھی والدہ سے معافی مانگنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ سمجھا کہ شفقت بغیر کہے معاف کر دیتی ہے۔

جب سعیدہ باجی نے پوچھا کہ کیوں فیروز نے آپ سے معافی مانگی تو انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اور انہیں فیروز کی نالائقی پر ایک بار پھر بڑا غصہ آیا۔

چند ہی روز بعد بہو کے میکہ سے خط آیا۔ سعیدہ باجی نے بغیر پڑھے اپنے ہاتھوں سے نذر آتش کیا اور ساتھ ساتھ دلہن کے میکے بھیجے ہوئے خط کو باہر ہی باہر اڑوا لیا۔

فیروز کی والدہ یہ نہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی انسان شر کی قوتوں کے زیر اثر آ جاتا

ہے۔آج کل یہی کیفیت ان کی تھی۔

گھر کی فضا مکدّر رہو گئی۔ میکے کا خط بند تھا۔ بہو بھی ملول رہتی۔ ان جلے خطوں میں کوئی کیا جانے کہ ایک خط میں ایک باپ نے اپنی بیٹی کو یوں لکھا تھا:

''عزیز از جان! بیٹی کئی ہفتوں سے بستر علالت پر ہوں۔ شاید وقت آپہنچا۔ تجھے دیکھنے کو دل ترستا ہے۔ خط پر خط لکھے جاتا ہوں۔ کوئی جواب نہیں پاتا۔ نگاہوں میں دم اٹکا ہوا ہے۔ اب آ بھی جا تا کہ تیرا باپ سکون سے مر سکے۔''

تیرا باپ

پھر اس خط کے کئی ہفتے بعد ایک ٹیلیگرام بھی آیا۔ اسے بھی سعیدہ باجی نے خود اپنے ہاتھوں سے نذر آتش کیا اور اسی دن ننھی بہو میکے کی یاد میں رات بھر روتی رہی

تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

جب گھر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو پھر تیلیوں کو جمع کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ تنکے تنکے کو کون جمع کرتا پھرے۔ وہ تو دن بہ دن آندھی کی زد میں بکھرتے جاتے ہیں۔ فیروز بھی گھر کے ماحول سے بددل رہتے۔ جب مرد کو گھر میں سکون نہ ملے تو وہ باہر سکون دل تلاش کرنے لگتا ہے اور تلاش کی کیا ضرورت۔ سامنے ہی تو روشن بائی کا کوٹھا تھا۔

ایک رات جب ننھی بہو کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوئی۔ اکثر پریشانی میں وہ کھڑکی سے ٹیک لگا دیتی۔ روشن بائی سے نگاہیں چار ہوتیں۔ وہ انہیں بڑے پیار سے دیکھتی۔ اتنی اپنایت، اتنی نرمی ان نگاہ میں ہوتی کہ وہ حیرت زدہ رہ جاتی۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ طوائف کی کوئی الگ ہی صفت ہوتی ہے۔ الگ تھلگ بے حیا، بے شرم لیکن یہ تو اپنے ہی جیسی ایک عورت ہے۔ جس کی آنکھوں میں دنیا جہان کا درد ہے۔ پیار ومحبت وسکون ہے۔ کیا نہیں ہے۔

آج جب وہ کھڑکی میں کھڑی ہوئی تو اس نے چلمن کے پیچھے جس کی جھلک دیکھی وہ

جھلک وہ نہ ہی دیکھتی تو اچھا تھا۔ وہ فیروز تھے۔ وہ بستر پر گر پڑی۔ وہ بڑی دیر تک روتی رہی۔ شوہر کے زعم ہی پر تو عورت ہر دکھ جھیل لیتی ہے۔ اس کا شوہر اس کا ہے۔ یہ احساس ہر غم کو ہلکا، ہر دکھ کو پھیکا کر دیتا ہے...... پھر کوئی بھی اس کا ہو جائے۔

بڑی دیر بعد اس کے آنسو تھمے۔ اس نے سوچا کہ ان دنوں فیروز کو سوا رنج و پریشانی کے گھر میں کیا ملتا ہے۔ ایسے میں مرد کیا کرے۔ باہر اماں اتنی باتیں کہہ دیتیں ہیں۔ یہاں میرا چہرہ دیکھتے ہیں۔ وہ غم بھلائیں تو کس کے پاس۔

نہیں اب وہ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرے گی۔ ہزاروں دکھ جھیلے گی۔ لیکن فیروز کے سامنے خوش رہے گی۔ اسے خبر نہ ہونے دے گی۔ وہ اسے دوسرے کا نہیں ہونے دے گی، کبھی نہیں، اس نے دل ہی دل میں عزم کیا۔ بڑی رات کو فیروز آئے۔ جھینپے جھینپے سے، کہا ''دوستوں میں دیر ہو گئی اور وہ چپکی رہی۔ اگر وہ یہی کہہ دیتے کہ وہ روشن آرا کے کوٹھے پر سے آئے ہیں وہ کیا کر لیتی، مرد کی زبان نہ ہی کھلے تو اچھا ہے۔ وہ انجان بن گئی۔ دوسرے دن ساس کے دوپہر کے سونے کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ سو گئیں تو اس نے اپنے بکس میں سے اپنے جہیز کا برقعہ نکالا۔ میکے کی یاد میں چند آنسو گرائے اور برقعہ اوڑھ کر باہر نکل گئی۔

روشن آرا کا کوٹھا سنسان تھا۔ اس نے اس کے پچھواڑے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''کون ہے؟'' آواز روشن آرا کی تھی۔ ''میں ایک ضرورت مند''۔ دروازہ کھل گیا اور روشن آرا اسے دیکھ کر متحیر ہو گئیں۔ ''آپ...... آپ یہاں کیوں آ گئیں۔'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ وہ اسے بیٹھک کی طرف لے چلی۔ پھر وہ یہ کہتی ہوئی آدھے راستے سے مڑ گئی۔

نہیں! نہیں!! میں تمہیں وہاں نہ لے جاؤں گی وہ جگہ غیر مردوں کے قدموں کی وجہ سے ناپاک رہتی ہے۔ تمہارے جیسی بی بیاں یہاں بیٹھنے کے لائق نہیں۔

یہ ایک چھوٹا سا عبادت خانہ تھا۔ کونے میں ایک چھوٹی سی چوکی بچھی تھی۔ جس پر مخمل کی جانماز تھی۔ سامنے جانماز پر مخمل کے جزدان میں گنگا جمنی رحل پر قرآن شریف تھا۔ پاس ہی تسبیح

رکھی ہوئی تھی۔اس نے روشن آرا پر نظر ڈالی۔شاید وہ عبادت کرتے کرتے اٹھی تھی۔سفید ساڑی پیشانی تک منڈھی ہوئی تھی۔ بھیگے ہوئے بالوں سے پیچھے کا آنچل تر تھا۔وہ اسے بڑی معصوم و پاک صاف عورت لگی۔اس نے اسے چوکی پر یوں بٹھایا جیسے وہ بھی کوئی متبرک چیز ہواور اس کے پاس خود بھی بیٹھ گئی۔

''کیوں آئی ہو تم ننھی بہو'' وہ اس کا خطاب بھی جانتی تھی۔''میں آپ سے ایک بات عرض کرنے آئی ہوں۔میرے شوہر کو مجھے لوٹا دیجئے اور مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔''اس نے جھک کر روشن آرا کے قدموں کو چھونا چاہااور روشن آرا نے جھٹ اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔

ہائیں یہ نہ کرو ننھی بہو! تم اپنے مقدس ہاتھوں سے میرے ان ناپاک قدموں کو نہ چھوؤ۔یہ ہاتھ صرف ایک کی خدمت کے لئے وقف ہیں وہ......وہ......اُس نے اپنے سینے سے لگایا۔

''نہیں آپ ایسا نہ کہئے۔حالات کبھی کبھی انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔ورنہ دنیا کی کوئی عورت اس پیشے کو خوشی سے نہیں قبول کرتی۔ایک گھر،اپنا شوہر،اپنے بچے کی تمنا کس عورت کو نہیں ہوتی''اور اسے اپنے سینے سے لگائے روشن آرا دور ماضی میں کھوگئی۔

آج فیروز کی دلہن کو دیکھ کر اس کے اندر عجیب سا رشک کا جذبہ پیدا ہو گیا۔بہت دنوں بعد اس نے ایک گھریلو شریف عورت کو اپنے اتنے قریب پایا تھا،اسے اپنا بچپن،اپنی ڈائن سوتیلی ماں،اس کے دل ہلا دینے والے مظالم،اس کی چار چار وقت کی فاقہ کشی،باپ کی لاپرواہی اور سونے پر سہاگہ یہ کہ سوتیلی ماں کے غنڈہ بھائی سے اس کی شادی کر دینا۔سب کچھ پردہ فلم کی طرح اس کی نگاہوں سے گذر گیا۔وہ غنڈہ،وہ لفنگا بھی اسے بیوی بنا کے رکھتا۔اس نے تو اسے بیچ دیا۔پھر وہ ایک غنڈے سے دوسرے غنڈے کے ہاتھوں منتقل ہوتی رہی۔آخر ایک دن چپکے سے بھاگ نکلی۔بھاگ کر بھیک مانگنے لگی۔کسی نے بھیک نہ دی۔کبھی اسے اسی دنیا کی طرف بلاتے جس سے اس نے راہ فرار اختیار کی،آخر بھوک سے نڈھال ہو کر اس نے خود کو گنگا کے حوالے کر

دیا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو کڑے پہرے میں پایا...... تب اس نے خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔۔۔ وہ بہت دیر تک دور خلاؤں میں اپنا ماضی تلاش کرتی رہی اور جب چونکی تو ننھی بہو جا چکی تھی اور ننھی بہو تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ دل میں پنکھ لگے تھے کہ کہیں ساس نہ جاگ پڑی ہوں۔

الٰہی خیر کیجیو۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے دیکھ لیا جو سارے فساد کی جڑ تھیں۔ اسی وقت سعیدہ باجی اس کے گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔

''کہاں گئی تھیں بہو، انہوں نے پوچھ ہی لیا۔'' ''جی ......جی'' اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ جلدی سے وہ اپنے کمرے میں پہنچی اور سعیدہ باجی ان کا دل تو بلیوں اچھلنے لگا۔'' اندھا کیا چاہے۔ دو آنکھیں...... انہیں دونوں آنکھیں مل گئیں۔ انہوں نے سوئی ہوئی ساس کو جھنجھوڑ ڈالا۔ ''دیکھئے بہو کہاں کے سیر سپاٹے کر کے آئی ہے۔'' وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ سعیدہ باجی نے ان کا ہاتھ پکڑا اور بہو کے کمرے میں لا کر کھڑا کیا۔ ننھی بہو جلدی جلدی برقعہ تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ ساس کو کھڑی دیکھا تو دل یوں دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر نکل جائے گا۔ ''یا اللہ عزت رکھیو۔ اگر معلوم ہو گیا کہ میں روشن آرا کے کوٹھے پر گئی تھی تو غضب ہو جائے گا۔ پھر ساس اور سعیدہ باجی نے لاکھ لاکھ پوچھ ڈالا۔ اس خدا کی بندی نے نہ بولنے کی قسم کھائی تھی، آخر نہ بولی۔ اس نے ساس سے صرف اتنا کہا ''میں آپ سے کہہ دوں گی کہ میں کہاں گئی تھی۔'' سعیدہ باجی کو یہ بات بڑی بری لگی۔ برقعہ اٹھایا اور چلتی بنیں۔ ویسے اب ان کے وہاں رہنے کی ضرورت کیا تھی۔ طوفان تو وہ اٹھا ہی چکی تھیں ان کے جانے کے بعد ننھی بہو نے خوشدامن کے قدم پکڑ لئے۔

میں روشن بائی کے کوٹھے پر گئی تھی۔'' ''کیوں؟'' وہ بڑ بڑا کر کھڑی ہو گئیں۔ کیونکہ کل میں نے ''انہیں'' اس کے کوٹھے پر دیکھا تھا۔'' ''کیا!'' انہیں جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا۔

''ہاں! امّی، میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' سعیدہ باجی کے سامنے نہیں کہا کہ وہ سارے محلے میں کہتی پھریں گی۔ امّی! میں نے روشن بائی سے کہا کہ خدا کے لئے مجھے

میرے شوہر کو لوٹا دو۔ مجھے اور کچھ نہ چاہئے۔ امّی مجھے آپ کی کوئی بات بُری نہیں لگتی کیونکہ آپ میری ماں ہیں۔ لیکن ان کی طرف سے میں کسی ناروا سلوک کو برداشت نہ کر سکوں گی۔ وہ بھبک بھبک کر رونے لگی اور فیروز کی والدہ کی آنکھیں کھلتی گئیں۔ اپنا ناروا سلوک یاد آیا۔ بیٹے کی دل برداشتگی یاد آئی۔ اتنا وہ بھی جانتی تھیں کہ جب مرد کو گھر کا سکون نہیں ملتا تب ہی وہ باہر کا سکون تلاش کرتا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ وہی اپنے بچے کی دشمن ہو گئیں۔ انہیں اپنا گھر برباد ہوتا نظر آیا۔ جلدی سے انہوں نے بہو کو اٹھا کے سینے سے لگایا۔ دل ہی دل میں عزم کیا کہ اب سعیدہ کو اس گھر میں نہیں گھسنے دوں گی۔ میرے بھرے پرے چمن میں اس نے آگ لگا دی۔

اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ سامنے روشن آرا برقعہ اوڑھے کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ روشن آرا آگے بڑھی۔ اس نے جھک کے ان کے قدم چھوئے۔

''اماں میں آپ سے کچھ عرض کرنے آئی ہوں۔'' فیروز کی والدہ کچھ بوکھلائی سی لگتی تھیں۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔

''کہو، کیا کہنا چاہتی ہو بیٹی۔'' پتہ نہیں کس جذبے کے تحت انہوں نے اسے بیٹی کہا۔ روشن سفید ساری میں ملبوس، ماتھے تک آنچل اوڑھے کوئی پارسا بی بی لگ رہی تھی۔ فیروز کی والدہ کے بیٹی کہنے پر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے کہا'' کاش میں آپ کی بیٹی بننے کے قابل ہوتی۔ میں گنہگار ہوں۔ ویسے اماں جب سے بوڑھی نائکہ بستر پر گری ہے میں نے جسم بیچنا ترک کر دیا۔ صرف ناچ رنگ کی محفل جمتی ہے۔ جانتی ہوں یہ بھی خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہے۔ لیکن کیا کروں، پیٹ بھی تو ساتھ ہے۔ کوئی مجھے نوکرانی بنا کر رکھنے کو بھی تیار نہیں ہوگا۔''

فیروز کی والدہ کو اس کے لہجے اور اس کی باتوں نے بڑا متاثر کیا۔ انہوں نے اس سے اس کی پوری داستان پوچھی۔ وہ بالکل گھریلو انداز میں اپنے ماضی کی ساری داستان سنا گئی۔ فیروز کی والدہ اس کی داستان میں ایسا محو ہوئیں کہ یہ پوچھنا ہی بھول گئیں کہ آخر وہ کس مقصد سے آئی

ہے۔خود اس نے ہی اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ اماں میں جانتی ہوں کہ سعیدہ باجی کس قماش کی عورت ہیں۔ایسی ہی عورتیں کتنی سلماؤں اور ننھی بہوؤں کو روشن آرا بننے پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کبھی کبھی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔ اگر ننھی بہو بیوقوف ہوتی۔ یا بات کچھ اور بڑھ جاتی تو آج وہ یا تو گنگا کی گود میں ہوتیں یا اگر مجھ جیسی بدنصیب ہوتیں تو کوٹھے پر پہنچ جاتیں۔ جہاں جہاں سعیدہ باجی کے قدم جاتے ہیں وہاں بغض وعناد کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ کتنے گھروں میں اس نے بیچ آنگن میں دیواریں کھڑی کرا دیں۔ کتنے شوہروں کو بیویوں سے بدظن کیا۔ کتنی سلمائیں بوڑھوں سے بیاہی گئیں۔کل کلاں میں آپ سنیئے گا کہ سیدو بھائی اور رشید و بھائی میں خون ہو رہا ہے۔"

روشن آرا پتہ نہیں کیا کیا کہتی رہیں اور فیروز کی والدہ کی گردن شرم سے جھکتی گئی۔ اسی وقت فیروز بھی آ گئے۔ روشن آرا کو دیکھ کر وہ جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ انہیں سکتہ سا ہو گیا تھا۔ جب انہیں ساری باتیں معلوم ہوئیں، جن میں یہ بھی شامل تھا کہ بہو نے آپ کو کوٹھے پر دیکھا تو وہ گھنٹوں سر نہ اٹھا سکے۔

روشن آرا بڑی دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کا یہاں سے اٹھنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ کیسا پیارا، کیسا مقدس ماحول تھا۔ اسے چاروں طرف سے ساس، بہو اور بیٹے نے گھیر رکھا تھا اور وہ خود کو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھ رہی تھی۔ اپنی گھناؤنی دنیا سے بہت بہت دور۔

بڑی دیر بعد وہ چونکی۔ کب تک یہ خیال خام رہتا، وہ ملول سے اٹھی۔ اس نے برقعہ اٹھایا اور جانے لگی۔ اس نے بتایا کہ اس نے برقعہ اس لئے اوڑھا ہے کہ محلہ میں چہ مگوئیاں نہ ہوں کہ آپ کے گھر ایک طوائف آئی ہے۔ فیروز کے گھر کے سارے لوگ اس کے جذبہ خلوص سے متاثر تھے۔

اس کے جانے کے فوراً بعد فیروز کی والدہ نے گلی کے دروازے میں جس سے سعیدہ باجی کی آمد و رفت تھی بڑا سا تالہ ڈال دیا اور ہمیشہ کے لئے سعیدہ باجی کا آنا جانا اپنے مکان میں

بند کر دیا اور انہوں نے ساری گھر داری بہو کے حوالہ کیا اور خود یاد خدا میں لگ گئیں اور خدا کے حضور میں گھنٹوں سجدہ ریز رہیں کہ عین وقت پر ایک نیک بخت نے ان کے گھر کے شیرازے کو بکھرنے سے بچالیا۔

چند ہی ہفتوں کے اندر لوگوں نے سنا کہ سیدو بھائی اور رشیدو بھائی میں خون ہوتے ہوتے بچ گیا۔ ایک بھائی ہاسپٹل گئے اور دوسرے کو جیل پہنچایا گیا۔ فیروز کی والدہ نے سنا تو بڑی دیر تک استغفار پڑھتی رہیں۔

آج جب روشن آرا کے جنازے کو قبرستان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی اور سعیدہ باجی کو بصد احترام اندر پہنچایا گیا تو..........

میں سلطان صلاح الدین ایوبی کو تلاش کرنے لگی۔ جو اس کعبہ کو جو ایک طوائف کا دل ٹوٹنے سے مسمار ہوا تھا بچالیتا۔

وہ طوائف! جس نے کتنے دلوں کو جوڑا، کتنے گھروں کی خوشیاں اسے لوٹائیں، کتنے لبوں کی دعائیں سمیٹیں۔

وہ بی بی، جنھوں نے کتنی سلماؤں کو بڈھوں سے بیاہے جانے پر مجبور کیا، کتنی ننھی بہوؤں سے ان کے دل کا سکون چھین لیا، کتنے باپوں کو دمِ رخصت بیٹی کے دیدار سے محروم کیا۔

جب ہی تو میں نے کہا:- کون جانے کون کس جگہ کے لائق ہے؟

کسے پسِ دیوار دفنایا جائے؟؟

کون کوئے یار میں سوئے؟؟

☆☆

شیشہ تہہ سنگ

جب وہ تابوت سے مسکراتی ہوئی باہر نکلی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے بستر پر جالیٹی تو سبھی لوگ دم بخود رہ گئے۔ ''اتنی ہمت!'' ''اتنی ٹھوس ذہنیت!'' ارے اس نے تو لڑکوں کو بھی مات کر دیا۔ باپ نے سائنس کیا پڑھائی، بیٹی بالکل پریکٹیکل مائنڈیڈ ہوگئی۔

میں تو کہوں کہ اس کے سینے میں دل بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس میں جذبۂ لطیف نام کی کوئی شئے ہے ہی نہیں......

ارے جذبوں کی لطافتوں سے تو لڑکے بھی آشنا ہوتے ہیں۔ ایک وہی دنیا سے نرالی ہے۔ جب ہی تو بھیا نے بھی جسے اپنی پسند بتائی تو میں نے کہا۔

''نہیں بھیا! نہ وہ بیوی بن سکتی ہے اور نہ ماں۔ اگر کسی پتھر کے مجسمے سے شادی کرنا چاہو تو اس سے ضرور شادی کرلو۔ ورنہ زندگی میں کبھی خوش نہ رہ سکو گے۔''

وہ سائنس کے لیبوٹری روم کی کوئی آپریٹس ہے۔ بے جان، بے حس، ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ وہ تابوت میں جالیٹی تھی۔ بھئی ہمارا تو دل دہل گئے۔ اچھا بھلا زندہ انسان تابوت میں جالیٹے۔ میں نے تو اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی امّی نے کئی بار تھپتھپایا۔ حد یہ کہ اس کے پاپا

بھی اس پر رضامند نہیں تھے وہ.........وہ تو ہے ہی پرلے سرے کی ضدی۔

بات یوں ہوئی کہ مکان کی اوپر منزل پر اس کا کمرہ ہے۔اپنڈیسائٹس کا اسے درد اٹھا۔ اپریشن کی فوری ضرورت تھی۔اسے نچلی منزل پر لے جانا تھا اور پھر ہسپتال پہنچانا ایک کام تھا۔گھر میں کوئی مضبوط آدمی تھا نہیں اور کسی کی گود میں جانے پر وہ رضامند بھی نہیں تھی۔ورنہ ہم کسی نہ کسی طرح اسے لے ہی جاتے۔کوئی اتنی کم چوڑائی کا پلنگ نہ تھا کہ زینے تک لے جایا جاسکے۔کوئی نہ کوئی بندوبست تو ہوتا ہی۔بس اسے جھک سوار ہوگئی۔پاپا تابوت میں تو مزے سے نچلی منزل تک چلے جائیں گے۔

اس کے پاپا بھی ہمیشہ امریکہ میں رہے ہیں۔لیکن پھر بھی اس کے لئے پہلے ہچکچائے۔ لیکن پھر اپنی علمیت، قابلیت اور اتنے دنوں امریکہ کا رہنا اور سب سے زیادہ وہ اپنی ہی بچی کی ٹھوس ذہنیت کے آگے سبک سے لگی۔ مسجد سے تابوت منگوا دیا۔ مسئلہ تو بڑا آسان ہوگیا۔ وہ بڑے مزے میں تابوت میں جاسوئی اور دونوکروں نے کاندھا دے کر نیچے اتار دیا۔ پاپا کسی بہانے باہر چلے گئے۔لیکن اس چھوٹے سے واقعے نے اس کی پوری شخصیت کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا اور جب بھیا نے اپنی خواہش کی تو میں اڑ گئی اور بھیا بھی خاموش ہوگئے۔ میں جانتی تھی کہ بھیا اسے شریک زندگی بنا کر کبھی خوش نہ ہوں گے۔خوبیوں کے لحاظ سے وہ لاکھوں میں ایک تھی۔صورت بھی چاند سی تھی۔ جب ہی تو بھیا۔ جنہوں نے کالج سے لے کر خاندان بھر کی کسی لڑکی کو قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔اس کے آرزومند ہوگئے۔

اور مجھے افسوس ہے کہ وہ بھیا کی شریک زندگی بننے کی اہل نہیں، پتھر سے سر ٹکرانا ہے تو بھلے اس سے شادی کرلیں۔ میں منع نہیں کرتی۔ بات تو آئی گئی ہوگئی۔نزہت کا اپنڈیسائٹس کا آپریشن ہوگیا۔وہ صحت یاب بھی ہوگئی۔

کالج میں تابوت کا قصہ ہر ایک کی زبان پر پہنچ گیا اور اس نے بڑی حیرت سے کہا—— ”بھئی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر اتنے چرچے کیوں ہو رہے ہیں۔ وہ میرا ذاتی معاملہ تھا۔

اس سے دوسروں کو کیا غرض'' اور لڑکیاں خاموش ہو گئیں۔

چند ہی مہینوں میں ہم لوگ نے بھیا کے لئے ایک اچھی سی دلہن پسند کر لی اور خوب ارمان و آرزو سے بھیا کی شادی رچا بیٹھے۔ میرے ہاتھ بھی پیلے کر دیئے گئے اور میں نے سنا کہ نزہت کی شادی بھی کسی انجینئر سے ہو رہی ہے۔ میں بہت خوش ہوئی کہ چلو اچھا ہوا کوئی پروفیسر یا ڈاکٹر نہ ہوا۔ انجینئر ہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انجینئرنگ کے لوگ ذرا پریکٹیکل قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ شاید کہ نبھ جائے۔

میری شادی ہو گئی اور میں اپنی شادی شدہ زندگی سے مطمئن بھی تھی اور مجھے بے حد مسرت ہے کہ بھیّا بھی خوش ہیں۔ البتہ نزہت کی شادی ہونے والی ہے اور مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ وہ انجینئر صاحب میرے شوہر کے کلاس فیلو ہیں۔ میں نے اپنے شوہر سے ان کی شکل و صورت پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ:

بس معمولی شکل و صورت ہے۔ رنگ خاصا سانولا ہے۔ تن و توش کچھ زیادہ ہے۔ عمر ہم لوگوں سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

مجھے کوئی فکر نہ ہوئی کیونکہ مجھے یاد آیا کہ ایک بار ہم کئی لڑکیاں کامن روم میں بیٹھی اپنے اپنے آئیڈیل پر تبصرہ کر رہی تھیں کہ اس نے بتایا۔

بھئی آئیڈیل وائیڈیل کیا۔ بس زندگی گذارنے کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ وہ جیسا بھی ہو۔ نہ میری نظر میں کوئی صورت ہے، نہ کوئی خاص خوبی۔ بھئی انسان سے شادی کرنی ہے نہ کہ صورت اور خوبیوں سے۔

چند مجبوریوں کی بنا پر میں اس کی شادی میں شریک نہ ہو سکی، ہاں! شادی کے بعد وہ خود ہی مجھ سے ملنے آئی۔ اس کے شوہر بھی اس کے ساتھ تھے۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو مجھے پتہ نہیں کیوں کچھ آسودگی کا احساس ہوا۔ شکل و صورت تو وہی تھی جیسی میں نے سنی تھی...... لیکن انداز سے مجھے محسوس ہوا کہ بالکل ''ڈیسنٹ منٹل'' آدمی نہیں ہیں۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو وقت سے پہلے

اپنے اوپر سنجیدگی اور بزرگی کا تاثر رکھتے ہیں۔ مجھے وہ کچھ ایسے ہی لگے۔ سوئی سوئی سی آنکھیں کسی خاص دنیا میں مگن۔ جس سے مخاطب ہوں بس وہیں تک دائرہ نظر محدود۔ ہمیں وہ کوئی خاص ذہین آدمی بھی نہیں نظر آئے اور سچ پوچھئے تو مجھے اس کی خوشی ہوئی۔ میں سمجھتی تھی کہ نزہت سے شاید ان کی نبھ جائے۔

نزہت میں شادی کے بعد نہ مجھے کوئی تبدیلی کی امید تھی اور نہ میں نے کوئی تبدیلی پائی۔ وہی پیور سلک کی گلابی ساڑی اور سفید بلاؤز پہنے، ہاتھ گلا زیور سے محروم۔ وہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ کپڑوں پر اس نے کبھی توجہ نہیں دی، میچنگ وغیرہ کی جھنجھٹ سے اسے کبھی سروکار نہیں رہا۔ ہماری باتوں پر وہ ہمیشہ ہنس دیا کرتی تھی۔

'ارے جاؤ' بس کپڑے صاف ہوں، میچنگ سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ شادی سے خوش ہو۔ ہسبینڈ پسند آئے تو اس نے کہا پسند کا کیا سوال۔ شادی ہونی تھی ہوگئی اور ——''Now I am well satisfied'' (کافی مطمئن ہوں) مجھے اس سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ پھر بہت دنوں تک مجھے اس کی خیر خبر نہیں ملی۔

ایک دن میرے شوہر نے بتایا کہ انجینئر صاحب تنہا سینما دیکھنے جا رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ بھئی یہ دوئی میں یکتائی کیسی۔ پارٹنر کے بغیر فلم دیکھنے آئے ہو۔

تو انجینئر صاحب ہنس پڑے۔ بھئی نزہت کو فلم وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے کہا۔ چلو تنہا ہی دیکھ آؤں۔

میں نے اپنے شوہر سے یہ بات سنی تو مجھے کچھ غصہ آیا۔ غضب کی فطرت پائی ہے اس نزہت کی بچی نے۔ کیا تھا اگر دلچسپی نہ تھی تو بھی شوہر کا ساتھ دے دیتی۔

لیکن پھر اس کی پوری زندگی میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔ لیکن میری خواہش ہوئی کہ ایک بار نزہت سے ملوں۔ اسے دیکھوں کہ اس نے اب بھی گھریلو نزاکتوں اور احساسات کی باریکیوں کو سمجھا ہے کہ نہیں۔

ایک بار ایک تقریب میں اس سے ملاقات ہو ہی گئی۔ اس نے مجھے بڑے اصرار سے اپنے گھر بلایا۔ مجھے بھی اس سے بہت ساری باتیں کرنی تھیں۔ اس لئے میں نے اسے یہاں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ میں دوسرے دن اس کے گھر بہت دیر تک ٹھہری۔ اس کی زندگی یا اس کی شخصیت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے شوہر حد سے زیادہ نیک ہیں۔ انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ ورنہ دونوں کی زندگیاں تلخ ہو جاتیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ فرصت کے اوقات بتانے کے لئے اس نے گرلس کالج میں سروس کرلی ہے۔

میں نے باتوں باتوں میں سنیما والی بات دہرائی۔ وہ ہنس پڑی۔ یہ روز روز فلم دیکھنا۔ سیر سپاٹے کرنا، یہ سب مجھ سے نہیں ہونے کا۔ میں نے کہہ دیا کہ آپ کا دل چاہے تو روز جایئے۔ لیکن ''فارگارڈ سیک'' مجھے مجبور نہ کیجئے۔

میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ اس پر خفا نہ ہوئے؟'' بھلا اس میں خفا ہونے کی کون سی بات ہے۔ ہر انسان اپنی مرضی کا مختار ہوتا ہے۔ اس کا دل چاہے تو ضرور جائیں۔ میں روکتی تو نہیں۔ پھر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں کالج سے دیر سے آئی۔ تھکی ہاری۔ وہ آفس سے پہلے آجاتے ہیں۔

''وہ آفس سے آکر مکان خالی پاتے ہوں گے'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! کیوں؟'' اس نے حیرت سے جواب دیا۔

''کبھی موڈ آف نہیں ہوتا؟''

میں نے تو کبھی محسوس نہیں کیا۔ اکثر میں لڑکیوں کو لے کر باہر چلی جاتی ہوں۔ ٹور نگ رہتی ہے — میں ایک لمبی سانس لے کر رہ گئی۔ اس میں محسوس کرنے کی صلاحیت ہی کہاں ہے کہ کچھ محسوس کرتی۔ تمہارے ان کو کوئی رنگ ونگ تو ضرور پسند ہوگا۔ ان کے پسند کی ساڑی تو ضرور پہنتی ہوگی۔ میں نے آج سب کچھ پوچھ ہی ڈالنا چاہی تھی — 'ہاں' انہیں ''ایش کلر'' بہت پسند ہے اور تم تو جانتی ہو کہ مجھے وہ رنگ سخت ناپسند ہے۔ بس وہی ایک ساڑی میرے پاس رکھی ہے۔

جو وہ پہلی بار لائے تھے۔

کبھی پہنا بھی تم نے اسے — ''نہیں'' ایک بار پہنا تھا۔ میں تو دکان میں شاپنگ کے لئے جاتی ہوں تو پہلے ہی دکاندار سے کہہ دیتی ہوں کہ بھئی ایش کلر، چھوڑ کر ہر رنگ دیکھانا۔''

میں اس کی باتوں سے بددل سے ہوگئی۔ پھر مہینوں ہم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک بار میری ایک دوست نے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ نزہت کے یہاں کی اب تک کوئی خوشی کی خبر نہیں سنی۔

میں نے جل کر کہہ دیا۔ وہ بیوی ہی کب بنی ہے۔ جو ماں بنے گی اور ہم دونوں بڑی دیر تک ہنستے رہے۔

میرے شوہر کہتے ہیں کہ نزہت کے شوہر کا ان کے دوست اکثر مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی سے مرعوب ہو گئے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ تنہائی دور کرنے کے لئے اپنے کمرے میں کسی مرد پارٹنر کو رکھ لیتے۔ ہر جگہ تنہا آخر کیا ہے؟

''نزہت کے شوہر نے کیا جواب دیا'' میں نے پوچھا۔

''وہ کہتے ہیں کہ یہ سب میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ ایک ''پرفیکٹ'' عورت ہے۔ ٹھوس شخصیت کی مالک۔ ایک ایسی شاخ جو جھکتی نہیں۔ ٹوٹ سکتی ہے۔ نزاکت و لطافت جیسی چیزوں کی اس کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔ وہ ان جذبوں سے واقف ہی نہیں ہے۔ اگر وہ ان چیزوں سے آشنا ہوتے ہوئے میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتی تو مجھے بھی شکایت ہوتی۔''

یہ سن کر میں اس کے شوہر کی شرافت کی دل سے قائل ہوگئی۔ وہ واقعی فرشتہ صفت آدمی ہیں۔ ورنہ نزہت کو بھگتنا آسان کام نہ تھا۔

ایک دن میرے شوہر نے بتایا کہ نزہت کے یہاں ڈیلیوری ہونے والی ہے۔ میں نے سوچا، چلو بی بنو ماں بھی بن ہی گئی۔ ان دنوں میں میکے چلی آئی تھی۔ میرا میکہ اور اس کا مکان بالکل پڑوس میں تھا۔ ایک کھڑکی درمیان میں تھی۔ ہم ایک آنگن سے دوسرے آنگن کی خبر لے لیتے۔

ایک دن نزہت کمرے میں بیٹھی تھی۔ 'بچہ' گود میں تھا۔اس کے شوہر بھی قریب ہی کرسی پر بیٹھے تھے۔ان دنوں وہ نزہت کا بڑا گہرا مطالعہ کر رہے تھے۔انہیں کچھ فکر بھی تھی کہ نزہت بچہ کو کس طرح پالے گی۔وہ اکثر سوچتے میں نے تو سب کچھ اپنے دل پر جھیلا۔اب بچے کی باری ہے۔بھلا نزہت ممتا کی نزاکتوں کو کیا سمجھے گی؟

اسی وقت نزہت کسی کام سے باہر چلی گئی اور بچے نے بری طرح رونا شروع کر دیا۔وہ مسکرا دیئے۔نزہت کو الٹے قدموں دوڑتے دیکھ کر انہیں بڑا اچنبھا ہوا۔

''ارے میرا لاڈلا'' اس نے بچے کو سینے سے لگایا۔وہ اکثر بچے کو سینے سے لگائے رہتی۔رات میں بھی بچہ جگاتا تو مسلسل ٹہلاتی رہتی۔حد یہ کہ کبھی انجینئر صاحب مدد بھی کرنا چاہتے تو یہ کہہ دیتی کہ ان کی صحت پر برا اثر پڑنے لگا۔کئی ہفتے گزر گئے۔

ایک دن ان کے شوہر نے کہا۔بھئی نزہت! اس طرح تو تم بستر پر پڑ جاؤ گی۔تم بے بی کے لئے آیا رکھ لو۔پھر تمہارا کالج بھی کھلنے والا ہے۔

''نہیں اب میں کالج واپس نہیں جاؤں گی۔سروس کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے وہ تو میں شوقیہ کرتی تھی اور ان ماؤں کے تو میں سخت مخالف ہوں جو روتے بچوں کو آیاؤں کے حوالے کر کے بیڈ روم بند کر دیتی ہیں۔ایسے بچوں میں ''فرسٹریشن'' پیدا ہو جاتا ہے اور آئندہ زندگی میں اثر انداز ہوتا ہے۔آپ جانتے نہیں ہیں۔چھوٹے بچے ماں کے علاوہ ہر گود میں ''اِن سیکوریٹی فیل'' کرتے ہیں اور......اور......میں نہیں چاہتی کہ میرا بچہ میرے علاوہ کسی اور سے مانوس ہو۔

انجینئر صاحب کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔وہ حیرت سے اسے دیکھتے رہے۔ان کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر تھا۔وہ باہر چلے گئے اور نزہت پھر بچے میں مگن ہو گئی۔

کئی دن بیت گئے۔نزہت سب سے زیادہ بچے ہی میں دلچسپی لیتی۔اس کے شوہر گم سم سے تھے۔یوں تو وہ ہمیشہ سنجیدہ سنجیدہ سے رہتے تھے۔لیکن ان دنوں وہ کچھ زیادہ ہی خاموش تھے۔

آج رات نزہت کی آنکھ بچے کے رونے پر کھل گئی۔اس نے بچے کو تھپتھپایا۔وہ سو گیا۔

تو اس نے دیکھا کہ اس کے شوہر بے چین سے آڑے ترچھے سو رہے ہیں۔ ایک ہاتھ کے نیچے ڈائری کھلی ہوئی پڑی ہے۔ اس نے چاہا کہ اس کو بند کر دے، وہ جھکی، ڈائری کے کھلے ورق پر اپنا نام دیکھ کر اس نے اسے اٹھالیا۔ لکھا تھا۔

نزہت میں تو سمجھتا تھا کہ تم لطیف جذبوں سے آشنا ہی نہیں۔ محبت کے تقاضے کیا ہیں، ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ ان سے تم بالکل لاعلم ہو۔ لیکن — لیکن نہیں۔ جب تم مکمل ماں بن سکتی ہو تو بیوی کیوں نہ بنیں۔ ماں کی محبت کی ساری لطافتوں، سارے تقاضوں سے تم آشنا ہو۔ پھر شوہر کی محبت کے تقاضوں سے تم انجان کیوں بنی رہیں؟

عورت کی محبت تو ایک درخت کے مانند ہے۔ جس کی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں۔ ہر شاخ اپنے مرکز سے حیات کی تابندگی پاتی ہے۔ میں نے سمجھا تھا کہ تم اس تابندگی کو بخشنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ یہ میری بھول تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شاخ اس سوت سے جلا پائے اور کوئی سوکھ جائے — نہیں نزہت! تم جان کے انجان بن گئیں۔ آج مجھے تم سے بڑا گلہ ہے۔

اس کے بعد ڈائری کے اوراق سادہ تھے۔ وہ ڈائری گود میں لئے متاسف سی رہی۔ پھر حیرت سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ جو بے خبر سو رہے تھے۔ پھر منے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے وہ بے اختیارانہ اپنے شوہر کو دیکھنے لگی، خواب اور بیداری کے عالم میں انجینئر صاحب نے پہلی بار نزہت کے پیار کی خوشبو محسوس کی۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

☆☆

مُعاوضہ

اظہر بھیا نے لاکھ سر پٹکا، ہزاروں منتیں کیں۔ لیکن اماں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ اماں نے جب بیٹے کو سخت دیکھا تو رونے لگیں۔

بیٹے! کیا اسی دن کے لئے پال پوس کر جوان کیا تھا کہ یوں دل دکھاؤ گے، کیا تم کو اس کا احساس نہیں کہ تمہاری بہن کنواری بیٹھی ہے اور لڑکوں کی کتنی قلت ہے۔ تم کو کہیں نہ کہیں شادی کرنی ہی ہے۔ آخر سلمٰی میں کیا برائی ہے۔

اظہر خاموش ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہیں کہیں نہ کہیں شادی کرنی ہی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ پچھلے چند برسوں سے اماں زرینہ کے لئے کتنی پریشان ہیں۔ رشید صاحب کے گھر والوں نے زرینہ کو پسند کر لیا۔ لیکن انہوں نے یہ شرط رکھ دی تھی کہ زرینہ کو جب ہی اٹھائیں گے جب سلمٰی کا بوجھ اماں ہلکا کریں۔

اماں پہلے تو سن کر خاموش ہو رہیں۔ پھر زمانے کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر حامی بھر لی، اظہر بھیا کو راضی کرنا ایک بڑا مسئلہ ہے اور انہوں نے رو دھو کر اس بڑے مسئلے کو بھی حل کر لیا۔

گھر میں شادیانے بجنے لگے۔ ڈھولک پر گیتوں کا حسن بکھرنے لگا۔ اماں تو جیسے نہالوں نہال تھیں۔ بڑے ارمان سے انہوں نے ان بچوں کو پالا تھا۔ بیٹے کی شادی تو ہر ماں کی دیرینہ آرزو ہوتی ہے، پھر یہ آرزو پوری ہوتی دیکھ کر اماں کیسے نہ نہال ہوتیں۔

اظہر بھیا حجلہ عروسی میں داخل ہوئے تو ان کا دل دھڑک اٹھا۔ پتہ نہیں کیسی ہو۔ اماں نے کچھ دیکھا بھی یا نہیں۔ انہوں نے جھجکتے جھجکتے گھونگھٹ اٹھایا۔ سلمیٰ کو دیکھا تو خوش ہو گئے۔ بھولی بھالی معصوم سی لڑکی۔ انہیں بڑا پیار آیا اس پر، جذباتی چنچل سی لڑکی۔ ان کے دل کی دھڑکن بن گئی۔ اماں بھی بیٹے بہو کو دیکھ کر جیتی تھیں۔ ایک ماں کو اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ اس کے سارے بچے شاداں اور فرحاں ہیں لیکن ان کی ساری خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ جب انہوں نے زرینہ کی موٹی موٹی آنکھوں میں غموں کے گہرے سائے منڈلاتے دیکھے۔ زرینہ وہ زرینہ ہی نہیں تھی۔ نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی، نہ آنکھوں میں بہاروں کی فضا۔ آخر بات کیا ہے۔ نئی دلہن کا تو انگ انگ خوشیوں سے ڈولتا ہے۔ ساتھ ہی کی بیاہی تو سلمیٰ تھی۔ کوئی بات کرتی تو پہلے ہنس دیتی۔ اماں بڑی فکر مند ہو گئیں۔ انہیں یقین ہو گیا کہ کوئی بات ضرور ہے۔ آخر ایک دن انہوں نے زرینہ سے پوچھ ہی لیا۔

پھر...... زرینہ جس کا دل غموں کے بوجھ سے پھٹا جا رہا تھا۔ سسکتی ہوئی اماں کے سینے سے جا لگی اور وہ سب کچھ کہہ سنایا جسے کہنے کو اس کا دل نہ چاہتا تھا۔ حقیقت یہ کہ رشید صاحب نے نگاہ اٹھا کے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ ایک طوائف زادی سے عشق کرتے تھے اور اسی پر اپنی جان و مال فدا کر رہے تھے۔

اماں نے یہ سب سنا تو ان کے تلوے کی لہر دماغ تک چڑھ گئی۔ اچھا تو یہ بات ہے رکھیں اپنی بہن کو اپنے پاس۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ اتنا خیال نہ آیا اس کو میری بیٹی غموں کی آنچ میں جھلسے اور ان کی بہن یہاں عیش کرے۔

سلمیٰ کے ساتھ بھی وہی ہو گا تو ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ اڑیل ٹٹو کی لگام تو میرے ہاتھ

میں ہے۔ میرا بیٹا لاکھ سلمیٰ کو چاہے یہ نہیں ہو سکتا کہ بہن کو روتا تڑپتا دیکھے اور بیوی کے ناز اٹھاتا رہے۔ وہ ماشاء اللہ بڑا فرماں بردار بچہ ہے۔

اظہر نے بھی فرمانبرداری کا ثبوت دیا۔ یہ سنتے ہی فوراً حکم دیا کہ اماں میرا پلنگ باہر لگا دیجئے میں اندر نہیں سوؤں گا اور جب ملازمہ کمرے سے پلنگ لے جانے لگی تو سلمیٰ حیران سی اسے تکتی رہ گئی۔ اس نے اس سے پوچھنا چاہا۔ لیکن پوچھ نہ سکی۔ اسے اکیلے کمرے میں نیند نہ آرہی تھی۔ اسے اظہر کا انتظار تھا کہ شاید ایک بار بھی اس طرف آئیں۔ لیکن اظہر نے ماں سے کھانا مانگا اور کھا کر پلنگ پر جا سوئے اور جب اس کا کھانا کمرے میں بھیج دیا گیا تو اسے بڑا دھکا لگا۔ وہ سبھوں کے سو جانے کا انتظار کرتی رہی۔ جب سارا گھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا تو وہ دبے پاؤں برآمدے میں آئی۔

اظہر سیدھے سوئے تھے۔ اس نے آہستہ سے ان کی پیشانی چھوئی۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ کروٹ لینا چاہا۔ لیکن سلمیٰ ان کے سینے پر سر رکھ چکی تھی——

''آپ کچھ خفا ہیں کیا؟'' وہ کچھ نہ بولے۔ سلمیٰ نے پھر پوچھا۔ مجھے بتائیے آخر مجھ سے کیا خطا ہوئی ہے۔ آخر یہ کیسی سزا ہے کہ خطاوار کو اس کی خطا معلوم نہ ہو۔

اظہر کا دل پگھلنے سا لگا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور سب کچھ اس سے کہہ سنایا۔ تو......تو......

آپ میرے بھیا کے سلوک کا مجھ سے انتقام لے رہے ہیں۔ سلمیٰ کی پھٹی آنکھوں میں صرف حیرانگی ہی حیرانگی تھی۔

تم ہی سوچو سلمیٰ۔ تمہارے بھیا زرینہ کے دامن میں صرف تلخیوں کے خار ڈالتے ہیں۔ میں تمہارے قدموں میں پھول چنتا ہوں۔ تمہارے بھائی کا دماغ سیدھا کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ میں تم سے قطع تعلق کر لوں۔ اظہر کی آواز خاصی تیز ہو گئی۔

سلمیٰ کو اظہر سے والہانہ محبت تھی۔ وہ ایک مشرقی لڑکی تھی جو شادی سے قبل سے ہی اپنے شوہر سے پیار کرتی ہے۔ اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی ہے۔ سلمیٰ کو بھی جب اس کے

خوابوں کی تعبیر اظہر جیسے خوش شکل وجیہ پیکر میں ملی تو اسے ایسا لگا جیسے اسے سب کچھ مل گیا ہو۔

وہ چپ چاپ اظہر کے پاس سے اٹھ گئی اور پلنگ پر خود کو ڈال دیا۔

تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

دوسری صبح بڑی پھیکی تھی۔ اظہر نے ناشتہ کیا۔ کپڑے بدلے اور آفس چلے گئے۔ اماں نے بھی سلمٰی سے بات نہیں کی۔ وہ دن رات اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ اب تو اظہر کی صورت اسے ہفتوں نظر نہ آئی وہ اس کے کمرے میں آتے ہی نہ تھے۔ باہر ہی کھایا۔ باہر ہی سوئے۔

''ایسی بے مروتی'' اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے، میری کوئی حقیقت نہیں۔ میرے جذبات، میرے احساسات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ خود ان کے دل میں میری کوئی محبت نہیں ہے۔ مجھے ایک معاہدہ کے تحت چاہا جاتا تھا۔ جس طرح معاہدے کے خلاف ورزی کے بعد اس کاغذ کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ اسی طرح اب میری کوئی قیمت نہیں۔ وہ سسکتی رہی۔

ہفتے مہینوں میں بدلے اور مہینے سال میں۔ جب ان لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ اب رشید صاحب زرینہ کو لینے نہیں آئیں گے تو چپکے چپکے سلمٰی کو بھی میکے بھیجے جانے کا پلان بنایا جانے لگا اور ایک دن جب بہ آواز بلند بڑی اماں نے اظہر کے سامنے یہ تجویز رکھی تو انہوں نے روکھے لفظوں میں کہا۔

ہاں بھیج دیجئے۔ اب انتظار فضول ہے۔ شاید بہن کو اپنی چوکھٹ پر دیکھ کر انہیں ہوش آجائے اور دوسری صبح کو اسے میکے بھیج دیا گیا...... وہ...... میکے کے در و دیوار سے لپٹ لپٹ کے روئی۔ کبھی وہ اس کی جدائی پر روئی تھی۔ آج واپس آنے پر رو رہی تھی۔ کوئی لڑکی اپنی زندگی میں کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ کبھی وہ سسرال سے ہمیشہ رہنے کے لئے میکے بھی بھیج دی جائے گی ——وہ یوں لٹی لٹائی بھی کبھی میکے آئے گی۔

شادی کے بعد میکے آنے کا تصور تو بڑا شاندار ہوتا ہے۔ چمکتی ہوئی افشاں، مسکراتے ہوئے ہونٹ، دمکتے زیورات اور شہنائی بجاتی چوڑیوں کا ہی میکہ سواگت کرتا ہے۔

لیکن اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ویران سے درودیوار کو تکتی، زخمی پاؤں کے بگولے، اٹھتے اور سونی دوپہر کو وہ ان یادوں کی تپش سے جھلس جھلس جاتی۔

ایسی ہی ایک گرم دوپہر تھی کہ رشید صاحب گھبرائے گھبرائے سے گھر آئے۔ وہ آفس سے آئے تھے اور بڑی افراتفری کے عالم میں گھر سے نکل گئے۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہ بھائی سے کچھ پوچھ بھی نہ سکی۔ خدایا! خیر، بھیّا اتنے بدحواس کیوں تھے۔ اس نے ملازم کو ان کے پیچھے دوڑایا۔ وہ فوراً ہی خبر لایا کہ ان کی محبوبہ کو اس کے کسی عاشق نے چھرا گھونپ کر مار دیا۔ وہ ہاسپٹل گئے ہیں۔ لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

وہ اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہے۔ آفس جانا تک چھوڑ دیا۔ کچھ دوستوں نے سمجھایا۔ بزرگوں نے فرض کا احساس دلایا۔ انہیں بھی تنہائی کا احساس تھا۔ کسی نہ کسی کے ساتھ تو زندگی بتانا ہی تھی۔ پھر اس نے کیا قصور کیا ہے۔ جسے مذہب اور سماج نے ان کے دامن سے وابستہ کر دیا ہے۔ وہ زرینہ کو لانے پر رضامند ہو گئے۔

سسرال میں بڑی خاطر مدارات ہوئی۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ بڑی اماں نے زرینہ کو وداع کیا۔ جیسے آج ہی رخصت کر رہی ہوں۔ آج ان کی مرادیں پوری ہو گئی ہیں۔ ان کی بیٹی کو اس کی خوشیاں مل گئی تھیں۔

اظہر کو بھی اپنا فرض یاد آیا۔ سلمیٰ کا حسن، اس کی معصومیت، اپنی بے التفاتی۔ اس کا غمگین و اداس چہرہ سبھی یادوں نے ان پر یورش کر دی۔ رات وہ ایک پل نہ سو سکے۔ جیسے ہی آنکھیں بند کرتے۔ سلمیٰ مجسم شکایت بن کر ان کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ انہیں حیرت تھی کہ اتنے دنوں انہوں نے سلمیٰ کے بغیر کیسے گزارے اور یہ رات اتنی لمبی کیوں ہو گئی ہے۔

صبح سویرے اماں نے انہیں بڑے تزک و احتشام سے۔ بہت سے سوغات کے ساتھ بہو کو لانے بھیجا۔ سارا دن گنگناتی رہیں۔ پورے مکان کی صفائی کی گئی۔ اظہر کے کمرے کو دلہن بنا دیا۔ اس گھر کی بہو آ رہی تھی۔ پورا گھر مجسم انتظار بن گیا۔

اظہر بھیا سسرال پہنچے۔ دن بھر سالے سالیوں میں گھرے رہے۔ سلمیٰ سے ملنے کا موقع انہیں رات ہی کو ملا۔

سلمیٰ کا سوگوار، مغموم چہرہ دیکھ کر ان کا دل بھر آیا۔ جذبات کی شدّت سے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ لیکن سلمیٰ نے ملائمیت سے ان کا ہاتھ ہٹا دیا۔ معاف کیجئے گا۔ محبت اور تجارت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

زرینہ کو اس کی خوشیاں مل گئیں۔ مجھے بڑی مسرت ہے۔ لیکن مجھے اس کی قیمت نہیں چاہئے۔ آیندہ آپ یہاں آنے کی کوشش نہ کریں۔

اظہر کے سنبھلنے سے پہلے وہ کمرے سے جا چکی تھی۔

☆☆

چڑھتا سورج

چڑھتے سورج کی دنیا پوجا کرتی ہے۔ اس کا حسن بھی چڑھتا سورج تھا۔ جس نے ہر ایک کی نگاہ کو خیرہ کر دیا تھا۔

سونے پر سُہاگا یہ کہ اقبال صاحب تنہا اولاد۔ خالہ امّی نے سوچا تھا کہ پھول کی طرح کوئی شہزادہ زری کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھے گا۔ لیکن انہیں کیا خبر کی دنیا کا سب سے بڑا حسن سنہرا سکّہ ہے۔ دینے کو اقبال صاحب ہزاروں کیا لاکھوں دے سکتے تھے۔ لیکن انہیں اپنی اکلوتی لڑکی کا دل تو نہ توڑنا تھا۔ زری کی حسین آنکھوں میں جھلکتا ہوا عزم کا نور۔ ارادوں کے تیز لپکتے ہوئے شعلے۔ اُف! خدا کی پناہ! میں تو پہلے ہی ٹھنک گئی تھی کہ اس سورج کے آگے پھیلے ہوئے ہاتھ جھلس جھلس جائیں گے۔ لیکن میں اس کو چھیڑنے سے ڈرتی تھی کہ کہیں وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو اقبال صاحب کے سامنے نا قابل عبور سمندر بن جائے۔ میں تو زری سے صرف یہ کہتی تھی۔ ''اے زری کی بچی'' جو تیرے اختیار میں نہیں، جو تیرے والدین کے بس سے باہر ہے۔ اس کے لئے اتنی کڑی شرط!''

لیکن وہ تو اٹل تھی۔ میں نے کب کہا ہے علوی کہ جو اختیار سے باہر ہے اس کے لئے اتنی جدوجہد کی جائے۔ اتنی آرزوؤں کو دل میں بسایا جائے۔

پگلی، جھوٹ نہ بول، کیا تیری آنکھوں میں خوابوں کے سائے نہیں ہیں۔ کیا ترا دل ایک ایسی ہستی کی پرستش کے لئے نہیں تڑپتا جو بالکل تیری آرزوؤں اور تیرے خیالوں کا ایک زندہ مجسمہ ہو۔ جس کے ذہن، جس کے دماغ کو تیرے مرمریں ہاتھوں نے تراشا ہو۔ اے...... زری کی بچی؟ تو کوئی مصور تو نہیں۔ کوئی بت تراش تو نہیں کہ جو چاہے سو تراش لے۔ تراشنے والے ہاتھ بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ جنہیں سماج سراہتا ہے۔ لوگ داد دیتے ہیں تو، تو اپنے آپ کو گیلی مٹی کا ایک تودہ سمجھ۔ پتھر کا حقیر ٹکڑا جس کو جو چاہے گا، جتنا چاہے گا، تراشے گا۔

لیکن زری تو مرنے مارنے پر تیار بیٹھی تھی۔ میری کیا سنتی؟ اور جب میں نے دیکھا کہ وہ کچھ سننے والی نہیں تو میں نے اس کی امی سے سب کچھ کہہ سنایا۔ آخر اس نے مجھے راز دار اس لئے بنایا تھا کہ میں اس کے خیالات امّی تک پہنچادوں۔

خالہ امّی گم صم ہوگئیں۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف تھیں۔ آج کے زمانے میں ایسا لڑکا ڈھونڈنا جو بغیر کسی مانگ کے ان کی زری کا ہاتھ تھام لے، جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ انہیں بڑا ارمان تھا اپنی زری کو بیاہنے کا اور یہ ارمان کس ماں کو نہ ہوتا۔ جیسے جیسے زری کی عمر کی منازل طے کرتی گئی اس کے حسن کے ساتھ اس کا شعور بھی نکھرتا گیا۔ پھر اس کے حسن کی خنک چھاؤں میں بہت سے لوگوں نے عمر بھر کی پناہ چاہی۔ لیکن یہ لوگ آفتاب کی سنہری کرنوں کے بھی اس سے طلب گار ہو گئے تو وہ کیا کرتی؟ اس نے تو فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ لوگ اسے نہیں بلکہ اس کی دولت کے اس انبار کو سمیٹنا چاہتے ہیں، جو خوشی سے یا مجبوری میں اس کے والدین اس کے لئے لگائیں گے۔ ان کو کوئی اور در دیکھنا چاہیئے۔

میں زری سے بحث نہیں کرتی۔ میرا دل اس کی باتوں سے الجھنے لگتا ہے۔ آخر تو نے کیا سوچا ہے زری؟ کیا تو والدین کے لئے ہمیشہ ایک نہ حل ہونے والا سوال بن کر رہے گی؟

پھر آفتاب بھائی آئے۔ وہ ٹاٹا اسٹیل فیکٹری میں انجینئر تھے۔ خوبصورت فلیٹ تھا۔ فیکٹری کی طرف سے ان کے اختیار میں ایک جیپ تھی۔ طرح طرح کی آسائشیں تھیں۔ اب اس کو کیا چاہئے کہ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی آفتاب بھائی بھی زمانے کے روش سے خود کو الگ نہ رکھ سکے۔ جب میں نے زری کو سمجھانا چاہا تو اس کی زبان شعلہ بن گئی۔

خبردار، آئندہ اس کا ذکر میرے آگے نہ کرنا۔ مجھ پر انجینئر یا ڈاکٹر کا رعب نہ ڈالو۔ جنہیں کوئی ضرورت نہ ہو، ان کی مانگوں سے مجھے اور بھی نفرت ہوتی ہے۔''میں چپ ہو رہی۔

پھر سلیمان بھائی نے زری کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا کالج میں پڑھاتا ہے۔ ہزاروں دلوں کی تاریکیوں کو دور کیا ہوگا۔ وہ صنف نازک کے جذبات سے بھی ضرور آگاہ ہوں گے۔ وہ ضرور سمجھتے ہوں گے کہ خودی کی بھی کچھ حقیقت ہے۔ چاہے وہ کمزوروں میں ہو یا طاقت والوں میں۔ ویسے کمزوروں کی خودی ہی کیا۔ شیشے کی نازک باریک سی دیوار جو ایک حقیر ذرے، لفظوں کے ننھے سے سنگ ریزے سے کرچی کرچی ہو جاتی ہے۔

اسے لفظوں کا الٹ پھیر کہئے یا حسن طلب، طلب تو سلیمان بھائی نے کچھ نہیں کیا۔ ''بس ان کے گھر والوں نے اتنا کہا۔ میری عزت، اقبال صاحب کی عزت اور اقبال صاحب کی عزت میری عزت بن چکی ہے۔ وہ اپنی لڑکی کو خالی ہاتھ تو ہمارے یہاں نہیں بھیجیں گے۔

تو پھر ایسی عزت سلیمان صاحب کو ہی مبارک''۔ زری نے کہا! اور میں زری کو سمجھا بھی نہ سکی۔ اس طرح مانگ اور حسن طلب کی چمک دمک کے درمیان زری کا آفتاب ماند پڑتا گیا۔ کئی سال بیت گئے۔ میرے والدین نے بھی بیس ہزار میں ایک ڈاکٹر داماد خرید لیا اور میں زری سے دور بڑی دور کلکتہ چلی آئی۔ میں زری کی دیوانی تو نہ تھی کہ ماں باپ کے آگے ایک ناقابل تسخیر قلعہ بن جاتی۔ کیا میں نے اقبال صاحب اور خالہ امی کا حشر نہیں دیکھا تھا اور خودی؟ خودی کا کیا ہے؟ ان نازک آبگینوں کو کوئی کب تک ٹھیس لگنے سے بچاتا رہے گا۔ ٹھیس لگنے کے لئے ہی تو ہم جیسی لڑکیاں عالم وجود میں آتی ہیں۔ تاکہ چکنا چور ہو کر ریزہ ریزہ ہو کر کائنات میں بکھر بکھر جائیں۔

ایک سال میں اپنے پپّو کی پیدائش پر میکے آئی تو سب سے پہلے زری سے ملنے گئی۔ زری وہی پہلے جیسی زری تھی۔ لیکن آنکھوں کے دیپ کچھ ماند سے پڑ گئے تھے۔ اب وہاں خوابوں کے سہمے سہمے سائے تھے۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ زری کے اس بچپنے پر بھی اور دنیا والوں کی ذہنیت پر بھی۔ بچے کسی چیز کے لئے ضد کرتے ہیں تو والدین اسے کسی نہ کسی طرح پورا کرتے ہی ہیں۔ پھر زری نے اگر ضد کی تھی تو معقول ضد تھی۔ اگر لوگ اس کی ضد مان لیتے تو یہ حسن، یہ نزاکت، یہ رعنائیوں کی بہار، تنہائیوں، مایوسیوں اور نامرادیوں کا شکار تو نہ ہوتی۔ زری نے کچھ زیادہ ہی ہمت کر ڈالی، ورنہ احتجاج تو ہر باشعور لڑکی کرتی ہے۔ زبان سے نہ سہی دل سے سہی، پتہ نہیں زری نے یہ بھاری جوا اپنے کندھوں پر کیوں رکھ لیا! کیوں ایک آدرش کی خاطر اپنی قربانی دے دی؟

''ارے زری اب تو ہوش میں آ۔ کیوں اپنا حسن، اپنی رعنائیاں برباد کرتی ہے۔ تیرا یہ حسین پیکر تو ایسا ہوگا جیسے ایک سونے مندر میں رکھی ہوئی مورتی، جس کا کوئی پرستش کرنے والا نہ ہو۔''

علوی، تو بھی ہمارے یہاں بڑی بوڑھیوں کی طرح بے کار باتوں میں اپنا دماغ خراب کرنے لگی۔ خدا کی قسم علوی آج دنیا کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ لڑکیاں اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائیں۔ اپنی منزل کی طرف خود رواں دواں ہوں۔ میں شادی کی ضرورت سے انکار نہیں کرتی۔ لیکن جبر کا سودا نہیں ہونا چاہیئے۔ راہ میں کوئی ہم خیال مل جائے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ورنہ ہم تو چل ہی پڑے۔ انتظار کا ہے کا؟ میں بی۔اے پاس ہوں، ایم۔اے کر کے کسی اسکول یا کالج میں سروس کر لوں گی۔ اگر میری مرضی کے خلاف شادی طے کی گئی تو میں عین وقت پر انکار کر دوں گی۔''

میں خاموش ہو رہی۔ اس سے بحث کرنا پتھر پر سر مارنا تھا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں دل پر بوجھ لئے واپس آ گئی۔

جلد ہی میرے شوہر مجھے لینے آ گئے۔ میرے شوہر کو بھی زری کے حالات سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا'' آپ زری سے ملی تھیں؟'' میں نے جواب میں زری کا سارا حال کہہ سنایا۔ وہ خاموش سنتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔'' بھئی! بہت سی غلطیاں انسان غلطی سمجھ کر نہیں کرتا۔ یہ تو نادانستگی میں سرزد ہو جاتی ہیں۔ لڑکا عموماً والدین کی آرزوؤں کی تکمیل کی دھن میں یہ بھول جاتا ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح۔ اگر اسے یہ خبر ہو کہ دوسری طرف کے جذبات اتنے شدید ہیں تو مجھے یقین ہے کہ پچاس فیصد لڑکے ان خطاؤں سے خود کو بچالیں۔''

میرے شوہر شاید اپنی پوزیشن صاف کر رہے تھے — چند دن بعد میں اپنے شوہر کے ساتھ کلکتہ واپس چلی گئی۔

ایک سال اور بیت گیا۔ ایک دن اچانک میری طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ امّی کو تار دیا۔ وہ آئیں تو میں سنبھل چکی تھی۔ امّی نے بتایا کہ زری کی نسبت طے ہوگئی ہے۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتی۔

''امّی! کس سے یہ نسبت طے ہوئی؟ اس نے مانگا تو کچھ نہ ہوگا؟'' — ''مانگا ہے، ان لوگوں نے بیس ہزار کی مانگ کی ہے'' — میں حیرت سے امّی کا منہ تکنے لگی اور زری رضامند ہوگئی؟ ...... نہیں! وہ کیا رضامند ہوتی۔ زبردستی سب کچھ ہو رہا ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی اسے سمجھاتا رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ وقت پر انکار نہ کر دے۔ کھانا پینا تک اس نے ترک کر رکھا ہے۔ میں ہکّا بکّا یہ سب سنتی رہی۔

امّی یہ تو بڑا ظلم ہے۔ آخر لوگوں نے اس کا سر جھکانے کا عہد پورا کر ہی لیا۔ اس کی تو ساری تپسیا بیکار ہوگئی۔ میرا دل رونے کو چاہنے لگا۔ میرا دل چاہا کہ ابھی میرے پر لگ جائیں اور میں اڑ کر زری کے پاس پہنچ جاؤں۔ دیکھوں اس کشتۂ تمنا کو جس کی ساری عمر کی ریاضت یوں اکارت گئی۔

میں نے ضد کی تو میرے شوہر آمادہ ہو گئے۔ میں جیسے تیسے گھر پہنچی، سامان پھینکا اور سیدھی زری کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

شادی کا سارا سامان زری کے گھر میں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ زری کے ہونے والے شوہر میڈیکل کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ بہت ذہین اور قابل آدمی ہیں۔ رہی بیس ہزار کی بات سو وہ تو زمانے کی رسم ٹھہری، رسم ورواج سے کون بھاگ سکتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ ہونے کو تو شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ لیکن ہر طرف فضا سہمی سہمی سی تھی۔ ایک انجانا سا خوف خالہ امّی اور اقبال صاحب کی نگاہوں سے جھانکتا ہے۔

میں نے اقبال صاحب سے کہا ''اقبال چچا، آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ خدا کے لئے اسے دل کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ اس کی ساری زندگی کی ریاضت کو یوں ملیامیٹ نہ کیجئے۔

میں نے ان لوگوں کو دیکھا تو سب کچھ بھول گئی۔ سچ مچ دونوں قابل رحم تھے۔ ایک ہی اولاد اس کی طرف سے بھی کوئی سکھ نہیں۔ کیسے کیسے ارمان ہوں گے۔ ان بوڑھے دلوں میں کہ کبھی کسی گھڑی کوئی انجانا، کوئی نو وارد، ان کو حیات کی تابندگی بخشنے آئے اور صرف ان کی بیٹی کی آرزو کرے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کی طرف نظر اُٹھا کے بھی نہ دیکھے۔ لیکن کون تھا؟ کوئی بھی نہیں! دور تک سناٹا تھا۔ کوئی آواز نہیں، کوئی صدا نہیں، کوئی دستک نہیں۔ وہ کان لگائے کب تک بیٹھے۔

خالہ امّی نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔ ''بیٹی، مجبوری میں یہ سب کچھ کیا ہے۔ جب شادی ہو جائے گی تو خدا خود بخود محبت دے دیگا۔ پھر زری کو بھی اپنی زندگی سے محبت ہوگی، اپنے شوہر سے بھی۔ اس کے سوا آخر میں کیا کرتی؟''

میں چپ چاپ ان کے پاس سے اٹھ آئی۔ زری سے ملنے کو میرا دل تڑپ رہا تھا ——— سفید مٹی کی جیسے، کوئی مورت ہو۔ چہرہ تھا یا کاغذ کا ٹکڑا۔ آنکھوں کے چراغ بجھ چکے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ جیسے گلاب کی پژمردہ پنکھڑیوں پر بارش کی ایک پھوار آئی ہو۔

''ارے زری، تیرا دولہا تو صرف تیری ایک جھلک کے لئے لاکھوں لٹا دے گا۔لیکن ابھی — تو چند سکوں کے لئے وہ یوں تیرا دل توڑ رہا ہے۔'' میں کہنا چاہتی تھی۔لیکن میں نے کہا نہیں۔لیکن زری اس کی آنکھیں ساون بھادو کو مات کر رہی تھی۔ میں چپکے سے اس کے کمرے سے نکل آئی۔

خوف اور اندیشوں کی فضا میں وہ دن بھی آیا۔جب زری کا دولہا اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔شہنائیوں کی گونج اور پٹاخوں کے شور میں، میں نے زری سے کہا ''زری چل، اپنی برات دیکھ لے۔یہ بھی ایک رسم ہے۔''

جواب میں زری نے مجھے اس طرح دیکھا کہ میں پسینے پسینے ہوگئی۔نفرت، حیرت، ملامت پتہ نہیں کیا کیا تھا ان آنکھوں میں۔ میں وہاں سے ہٹ ہی گئی۔ پھر کاموں کے انبار سے میں سر نہ اٹھا سکی۔

تقریباً بارہ بجے رات کو میرے شوہر نے مجھے باہر کے کمرے میں بُلا بھیجا۔میں حیران حیران سی ڈرائنگ روم میں جا کھڑی ہوگئی۔ میں کھڑی انتظار کرتی رہی۔شاید انہیں کوئی کام نکل آیا تھا۔تھوڑی دیر بعد وہ آئے۔جوش سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''جانتی ہو میں نے تمھیں کیوں بلایا ہے؟''

''کیوں؟'' میں ان کا منہ تکنے لگی —— کہتے ہیں نا کہ طلب صادق ہونا چاہیئے۔ منزل خود ہی گلے آلگتی ہے۔تمہاری زری کی طلب بھی سچی ہے۔زری کا دولہا میرا پرانا ساتھی نکلا۔ احمر رضا بڑا نیک اور سنجیدہ انسان ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے چاہا کہ اسے حالات سے کسی حد تک آگاہ کردوں، لیکن اس سے پہلے خود اس نے مجھے جو کہا۔سب لوگوں کو حیران کر دیا۔اس نے کہا کہ وہ ملک سے باہر تھا۔معلوم نہیں کہ شادی کیسے طے ہوئی۔ اچانک اسے شادی کی اطلاع دے کر بلایا گیا۔اس کے والدین تو زندہ ہیں نہیں۔ساری باتیں اس کے عزیزوں نے طے کیں۔ پرسوں وہ آیا تو اسے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے اس کی بڑی بڑی

قیمتیں لگائی ہیں۔اسے اتنا شدید غصہ آیا کہ جس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔اس نے اسی وقت طے کر لیا کہ ایک پائی بھی جہیز کی نہ لے گا۔اسے صرف ایک اچھی سی لڑکی چاہئے تھی وہ اسے مل گئی اسے اور کچھ نہیں چاہئے۔

میں یہ کہانی سن کر ہکا بکا رہ گئی۔میرے شوہر اس کے بعد پتہ نہیں کیا کیا کہتے،مگر میں زری کو خوش خبری سنانے کے لئے بھاگ چکی تھی۔جو یقیناً وقت پر انکار کا تہیہ کئے بیٹھی تھی۔

☆☆

ذرا عمرِ رفتہ کو......

اس نے ہوش سنبھالا تو اپنے آگے چار چھوٹے بھائی بہنوں کو پایا۔ جن کی ذمہ داری بڑی حد تک اسی کے سر تھی۔ کیونکہ وہ گھر کی بڑی تھی۔ امّی گھر کے کاموں میں پریشان رہتیں۔ اس لئے دس بجے سے پہلے ناشتہ تیار کرنا، ابّو کے کپڑے درست کرنا، ناشتہ دان بھرنا، منّے کو اسکول کی یونیفارم پہنانا، اس کا بستہ دیکھنا۔ ٹفن کا ڈبہ بھرنا، چھوٹی کا بستر دھونا، بے بی کو اسکول لے جانا وغیرہ۔ کتنے ہی ایسے کام تھے جو بہت چھوٹی سی عمر سے اس کی ذمہ داری بن گئے تھے۔

امی کا سارا کا سارا وقت باورچی خانے کی نذر ہو جاتا۔ ادھر چھوٹی روتی تو امی وہیں سے پکارتیں۔

''بے بی ذرا چھوٹی کی دودھ کی شیشی دھو کے لانا۔''

''بے بی ذرا چھوٹی کو دیکھنا بیٹا۔ اگر اس نے بستر خراب کر دیا ہو تو کروٹ بدل دینا۔''

''بے بی ذرا ابو کی قمیص دھو لو۔ شام کو تمہارے ابو کو کہیں جانا ہے۔''

اس طرح چھوٹے بھائی بہنوں کی ذمہ داریوں کو نبٹاتے بے بی خود اپنی دیکھ بھال اور

اپنی ذات کی نگہداشت کی عادی ہوگئی۔ اس نے کبھی اپنے کپڑوں کی مرمت اپنے بالوں کی آرائش، اپنے چہرے کی صفائی کے لئے امی کی محتاجی محسوس نہیں کی اور امی نے بھی اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے کبھی اس کی ان ضرورتوں کی طرف توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا۔

ان ہی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے بے بی دبے پاؤں آگے بڑھتی رہی۔ منزل بہ منزل اس نے عمر کی سترہویں سیڑھی پر قدم رکھا۔ یوں کہئے کہ خودرو پودے کی طرح بے بی قدرت کے ہاتھوں پلی بڑھی اور چھوٹے بھائی بہنوں کے کونپلے جیسے وجود کے درمیان ایک نازک تروتازہ شاخ گل کی طرح مہک کر کھڑی ہوگئی۔ امی کی آنکھیں اسے دیکھ کر جھک گئیں اور انہیں اس شاخ گل کو سرخ قبا پہنانے کی فکر دامن گیر ہوگئی۔

امّی کی نگاہ بے بی کے ابو کے ایک دوست کے فرزند پر ٹکی، جواُن ہی کے آفس میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے اور یوں اس شاخ گل کو سرخ قبا پہنانے میں امّی کو کچھ دیر نہ لگی۔

بے بی جس گھر میں بیاہ کے آئی وہ گھر اس کے اپنے گھر سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ رزاق صاحب اور اس کے ابو دونوں ہی آفس میں کام کرتے تھے۔ تنخواہ بھی دونوں کو تقریباً برابر ملتی تھی۔ بچے دونوں کے برابر ہوئے۔ یوں اپنے گھر کی ذمہ داریوں میں گھری ہوئی بے بی بالکل اپنے ہی گھر جیسے دوسرے گھر کی ذمہ داریوں میں گھر گئی۔ وہی مسائل تھے۔ ویسی ہی ضروریات اور ایک ہی جیسے حالات۔

وہاں بے بی بڑی بہن تھی۔ یہاں بڑی بھابی تھی۔ فرق کیا پڑا۔ وہاں بے بی چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کرتی۔ یہاں چھوٹی نندیں اور دیور اسی کی توجہ کے محتاج تھے۔ وہاں وہ امی کو کاموں میں گھراپاتی تو ہاتھ بٹانے لگتی۔ یہاں ساس کو ذمہ داریوں میں الجھا پاتی تو نبٹانے لگتی۔ یہاں بھی بے بی کو اپنی ذات کے لئے نہ کچھ وقت ملا نہ موقع۔ اس کی ذات اپنے سے چھوٹوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔

اپنے گھر میں جس طرح ابو اس کے ساتھ منی کے لئے پن اور ہیئر پن، چوڑیاں لایا

کرتے تھے۔اسی طرح اس کے سسر بھی جب اس کے لئے کوئی چیز لاتے تو اپنی بیٹیوں کے لئے بھی ضرور لاتے وہ خود بھی جب جاوید سے کوئی چیز منگواتی تو اپنی ہم عمر نند روزی کو کبھی فراموش نہ کرتی۔ جاوید کھانے کی چیزیں لاتے تو جامی اور نکی کے درمیان تقسیم کر دیتی۔ اس طرح اس نے اپنی ذات کو تنہا کبھی نہ سمجھا ——— پھر وقت نے آہستہ آہستہ چھوٹی نندوں اور دیوروں کو اس سے جدا کیا۔ دو سال بعد روزی کی شادی ہوگئی۔ چار سال کے وقفے کے بعد نکی بیاہی گئی۔

جامی اور نکی کئی برس تک بے بی کی توجہ کے مرکز بنے رہے کیونکہ وہ ان کی بھابی تھی۔ جب وہ بیاہ کے آئی تھی تو یہ دونوں بھائی سات اور نو سال کے تھے۔ان دنوں دیوروں کو بھابی سے خاص اُنسیت تھی۔ جب یہ لوگ پڑھ لکھ کر قابل ہوئے تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔لیکن چین اس کے لئے کہاں؟ اس وقت تک اس کے اپنے چاروں بچے اسکول جانے لگے تھے اور تب بے بی نے سوچا کہ اپنے ان بچوں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی وہ صحیح معنوں میں سکھ کی سانس لے سکے گی۔ پھر دنیا اس کی اپنی دنیا ہوگی۔ وہ ہوگی اور اس کی ذات ہوگی ورنہ اب تک تو اس کی زندگی یوں بیتی ہے کہ اسے خود خبر نہیں ہوتی کہ کب صبح ہوتی ہے، کب شام، کب ہفتہ بیتا، کب مہینہ آیا اور اب کون سا سال ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ اپنی ذات کو الگنی پر لٹکے ہوئے کپڑے کی طرح ڈال دیا جائے۔

اس نے خوشی سے سوچا اب تو بس ان ہی چاروں کو منزل تک لے جانا ہے۔ پھر وہ ہوگی اور اس کی اپنی دنیا۔ اپنی تفریحات، اپنی دلچسپیاں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے اب تک کسی تفریح میں شوق سے حصہ نہیں لیا۔شادی سے اب تک جاوید کئی بار سنیما کے یا شہر میں آئے ہوئے سرکس اور مینا بازار کے ٹکٹ لایا۔ ایسے موقعوں پر وہ یہ سوچ کر دل ہی دل میں بڑی الجھتی کہ یہ بھی کوئی تفریح ہے۔ شو ختم ہونے کے بعد بھاگم بھاگ گھر آئے۔لباس بدلئے یا منہ ہاتھ دھونے سے پہلے چیختی چلاتی منی کے منہ میں دودھ کی شیشی لگایئے۔ جتنی جلد ممکن ہو منی کے ابو کو ایک پیالی چائے تھمایئے پھر پہلے سے گندھے ہوئے آٹے سے خسر کے لئے رات کے کھانے کی

روٹی پکائیے۔ کیونکہ بوا سر پر سوار ہیں کہ تاؤ دھیمی ہو جائے گی تو روٹی لکڑی ہو جائے گی۔ غرض سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ اسی لئے ان تفریحات کے ذکر سے اس کا منہ کڑوا ہو جاتا۔ اس کا موڈ دیکھتے ہوئے جاوید آہستہ آہستہ ٹکٹ لانا ہی بند کر دیئے۔

اب اس نے سوچا کہ ان چاروں کو پار گھاٹ لگا لے تو وہ خوب جی بھر کے تفریح کرے گی۔ جاوید سے کہہ کہہ کر ٹکٹ منگوائے گی۔ خدا جلد ان ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دے۔

اس نے گاڑی کی اسپیڈ اور تیز کر دی تا کہ جلد از جلد مسافروں کو منزل تک پہنچا دے۔

صبح کو منہ اندھیرے اس کی آنکھ کھلتی، وہ ہڑبڑا کر پلنگ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیٹوں کو کالج بھیجنا، لڑکیوں کو اسکول پہنچوانا۔ جاوید کو نو بجے سے پہلے آفس کے لئے روانہ کرنا۔ وہ بوکھلائی سی سنگھار میز تک جاتی، دو بار کنگھا سر پر مار کر کھلے بالوں کو کسی طرح لپیٹ کر چندیا پر ٹھونک دیتی۔ چولھے میں آگ سلگاتی۔ کبھی دوڑ کر کمرے میں آتی۔ کبھی دوڑ کر کچن میں پہنچتی۔ کبھی جاوید اس کے اپنے کمرے سے پکارتا —— بھئی، تم نے کل دھو کر میری قمیص اور بنیان کہاں رکھی ہے؟" تو کبھی دونوں لڑکے شمسی اور عظمی چیختے۔ امّی، آپ نے کمرہ کیا درست کیا کہ میرے سارے سامان کو خدا جانے کہاں ڈال دیا" وہ دونوں لڑکیاں الگ اس کو مدد کے لئے پکارتیں۔ "امّی، میرا بستہ پھٹ گیا۔ سی دیجئے" وہ سمجھاتی "کل سی دیں گے۔" "بیٹا دیکھو! اس وقت ابو بھی آفس جا رہے ہیں۔ بھائیوں کو کالج جانا ہے۔" لیکن وہ کسی طرح نہ مانتی۔

ان سب کو جیسے تیسے کالج، اسکول، آفس بھیج کر وہ گھر کے دوسرے کاموں میں اس طرح پھنستی کہ گیارہ بارہ بجے رات کو ہی بستر پر جاتی —— وقت کی تیز رفتاری نے بے بی کی بڑی مدد کی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بالشت بھر کے بچے بانس برابر ہو گئے۔ دونوں بیٹوں نے آئی.ایس.سی کرنے کے بعد ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ بیٹیوں میں بڑی پندرہ سال اور چھوٹی کے تیرہ سال بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ ان کے ہاتھ پیلے کرنے کی اسے فکر لگ گئی۔ اس

نے تہیہ کرلیا کہ دونوں لڑکیوں کی ایک ساتھ شادی کرے گی۔ اپنی سب ہی ملنے والوں کو اس نے اچھے لڑکے تلاش کرنے کی مہم پر لگا دیا۔

بڑی کدو کاوش اور دوڑ دھوپ کے بعد دونوں لڑکیوں کی نسبت طے ہوگئی۔ انہوں نے بیوی سے کہا ''اچھا تو ہے، میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ابھی بڑی کو ان جھمیلوں سے دور رکھا جائے'' مگر بے بی کا دل دھک سے رہ گیا۔

گاڑی جلد سے جلد بوجھ سے اپنا جسم خالی کرنا چاہتی تھی تاکہ کچھ اپنی دنیا پر بھی نظر ڈالنے کی مہلت اسے ملے۔ اتنے عرصے تک اس نے اپنی ہر خواہش کو بالائے طاق رکھا تھا۔ ایک سے ایک فلمیں آئیں۔ کئی ایسی جگہوں سے بُلاوے آئے جہاں جانے کی اس کی دلی آرزو تھی۔ لیکن اس نے سوچا اب تو سب کاموں سے نبٹنے کے بعد ہی سکون سے گھومنے نکلیں گے۔

آخر وہ مبارک دن بھی آپہنچا۔ جب گاڑی نے اپنے سواروں کو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔

اس روز بے بی نے یوں چونک کر آنکھیں کھولیں۔ جیسے کسی دوسری دنیا میں سانس لے رہی ہو، اب کوئی نہیں، صرف وہ ہے، اس کی اپنی ہستی ہے اور اپنی دلچسپیاں ہیں۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر کنگھا اٹھالیا۔

جب سے پیدا ہوئی دوسروں کا رونا، دوسروں کا ہنسنا سنا، ہم بھی روتے ہیں۔ ہم بھی ہنستے ہیں۔ ایسا کبھی خیال نہ آیا۔ آج نہ آگے کوئی ہے اور نہ پیچھے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اپنی عمر سے بیس سال پیچھے چھلانگ لگا گئی ہو۔

اسی دن کے لئے تو جیتے تھے۔ اس نے کھلی فضا میں لمبی سانس لی۔ آزادی کا احساس بھی کتنا مسرت آگیں احساس ہے۔ کنگھا کرتے کرتے کئی چاندی کے تار چمکے۔

کم بخت یہ بال! اس نے ان بالوں کو پٹ پٹ توڑ دیا۔ آج کل یہ بیماری بھی خوب عام ہوگئی ہے۔ گود کے بچے کے بال سفید ہوتے جارہے ہیں۔

اس نے خوب اونچا جوڑا باندھا۔ صوفے پر سے جھک کر اپنی گلابی بنارسی ساڑی اٹھائی

اور باندھنے لگی۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں سے چھٹی کا بلاوا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی لڑکی کے یہاں لڑکا ہوا تھا۔

آج وہ بالکل نئے احساس کے ساتھ ان کے یہاں جا رہی تھی۔ ''اُف! میری ڈاڑھ میں رات سے پتہ نہیں کیوں درد ہے۔ شاید گوشت دانت کے اندر رہ گیا ہے۔''

اس نے جلدی جلدی تیاریاں مکمل کیں اور ساڑی سے ملتا جلتا پرس ہاتھ میں لیا۔

ڈپٹی صاحب کے یہاں وہ وقت پر پہنچی۔ اس کے پاس بیٹھی خواتین اس کی جان پہنچان کی تھیں۔ سب نے اسے دونوں بیٹیوں کی شادی پر مبارکباد دی۔

بھئی، آپ خوش نصیب ہیں۔ ساری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئیں۔ ہماری ذمہ داریاں تو ابھی باقی ہیں۔''

لیکن اب آپ کیا کریں گی مسز جاوید۔ بیکاری تو آپ کو بہت کھلے گی۔ بیٹوں کی شادیاں کر چکی ہوتیں تو پوتے پوتیوں کے کھلانے میں وقت بیت جاتا۔''

''ہاں بھئی''، وقت کس طرح بتایا جائے یہ بڑا بھاری سوال ہوتا ہے۔؟''

''یادالٰہی میں بتائیں گی اور کیا'' ایک مذہبی بی بی نے کہا۔

وہ بدمزہ سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ جس طرف رنگین دوپٹوں کی قوس قزح اور ساڑیوں کے کناروں کی شفق پھوٹ رہی تھی اس طرف بڑھ گئی۔

ان کی محفل میں بیٹھنے پر اسے احساس ہوا کہ ان لڑکیوں اور نئی بہوؤں نے اسے دیکھ کر بڑی چابکدستی سے موضوع گفتگو بدل دیا تھا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی تھیں۔

''خالہ، روشنی کب آئے گی؟ ہائے اللہ، اتنی جلدی آپ نے اسے ہم سے جدا کر دیا۔'' وغیرہ — اس نے کئی بار موضوع بدلنا چاہا تو ان لوگوں نے ساتھ نہیں دیا۔ آخر اس نے محسوس کیا کہ یہ نوجوان عورتیں اس کے اٹھنے کی منتظر سی تھیں۔ چنانچہ وہ وہاں سے اُٹھ گئی۔

''یہ تو کباب میں ہڈی ثابت ہوئی بھئی۔'' ایک گولی سنسناتی ہوئی اسے کانوں تک پہنچ

گئی۔ ''بعض بزرگ خواتین کبھی کبھی ہم لڑکیوں کی گفتگو کے معیار کا امتحان لینا چاہتی ہیں۔ دیکھا نہیں کیسا گھوم پھر کر سنیما اور سرکس کی طرف آرہی تھیں تا کہ ہم لوگوں کی ذہنیت کا اندازہ لگا سکیں۔''

پھر اس محفل میں اس کا دل نہیں لگا۔ وہ اُچاٹ اُچاٹ سی چلی آئی۔

جاوید نے مسکرا کر اسے دیکھا ''بڑے ٹھاٹ ہیں آج تمہارے۔'' وہ شرما گئی۔

بھئی بہت دن سے کوئی فلم نہیں دیکھی ہے۔ آپ کو پتہ ہے، کون سی اچھی فلم چل رہی ہے؟''

جاوید نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر کہا ''رشید سے پوچھیں گے۔ ان کو ہی فلموں کا زیادہ شوق ہے۔ مگر یہ تو کہو، بڑھاپے میں یہ شوق کیوں جاگا ہے۔''

اس کے دل کو کسی نے مٹھی میں کس لیا۔ بزرگ! بڑھاپا! —— ''یا اللہ! کیا میری ساری تگ و دو کا یہی حاصل ہے۔''

اس نے گاڑی اس لئے تیز بھگائی تھی کہ اسے فوراً لوٹنا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ عمر رفتہ کی بڑھی ہوئی گاڑی کبھی نہیں لوٹتی، آج آج ہے اور کل کل تھا۔

جاوید کے کراہنے سے اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا کیوں، کیوں، کیا ہوا؟ اسے ایسا لگا جیسے کنوئیں کے اندر سے آوازیں آرہی ہوں۔

''کمر میں درد ہے۔ شاید گٹھیا کی شکایت ہو گئی ہے۔ اب عمر بھی تو ہو گئی ہے۔ میں تو تمھارا شکر گذار ہوں کہ تم نے میری ساری ذمہ داریوں کو بہت جلد نبٹا دیا۔ جب کہ میرے دوستوں کی ابھی بہت ساری ذمہ داریاں باقی ہیں۔ اسی سال کے آخیر تک ہم سب ریٹائر ہو جائیں گے۔''

اسے ایسا لگا جیسے اچانک اس کی داڑھ کا درد بہت بڑھ گیا ہو۔ اس نے کہا ''بھئی میرے دو دانت نکلوا دیجئے۔ بہت تکلیف ہوتی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ وضو کرنے کے لئے اُٹھ گئی۔

☆☆

مسرّتوں کی قیمت

باجی! ابو میری مسرّتوں کی قیمت دو سو لگاتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں حلق پھاڑ کر ہنسوں اور سینہ پیٹ کر روؤں۔ میں ہنستی ہوں تو ابو سہمی سہمی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہیں اور روتی ہوں تو امی کمرے کے دروازے بند کرنے لگتی ہیں۔ کیوں باجی آخر کیوں؟ یہ لوگ میری حرکتوں سے یوں شرمندہ ہوتے ہیں۔ گریباں میں منہ ڈالو باجی! میں روتی ہوں اپنی تیرہ بختی پر اور ہنستی ہوں تمہاری عقل پر——ہاہا!! میری مسرّتیں نہ ہوئیں چاندی کی پگھلتی ہوئی تجوریاں ہوئیں۔ کاغذ کے سبز سبز پرزے ہوئے۔ باجی! انسانی جذبات، احساسات، مروّت، شفقت ان ساری چیزوں کو تم لوگ کس خانے میں رکھتی ہو۔ جلدی سے مجھے بتاؤ—— ہوسکتا ہے، میرا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہوجائے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ تم ہی یہ بتانے کے قابل نہ رہو۔

واہ، خوب باجی! آصف بھیا چار سو روپے کماتے ہیں۔ وہ مجھے مسرّتیں ہنسی بخش سکتے۔ ابو کی لاڈلی صاحبزادی کے دامن میں چاند ستارے نہیں ٹانک سکتے۔

ہے نا یہی بات!——اس لئے ابو نے محمود صاحب کا انتخاب کیا ہے۔ فیکٹری والے ہیں

مسرّتیں ڈھالتے ہیں۔ منڈیوں میں رکھواتے ہیں۔ بین الاقوامی پیمانے پر دوسرے ملکوں میں سپلائی کرتے ہیں۔

واہ خوب! پھر میرا دل قہقہے مار کر ہنسنے کو چاہ رہا ہے اور میں ہنسوں گی تو ابو پھر سہم جائیں گے اور امی دروازے بند کرنے لگیں...... تم لوگ مجھے صحیح الدماغ نہیں سمجھتے ہونا۔ لیکن کون تم سے کہے صحیح الدماغ وہ نہیں ہوتے جو انسانی قدروں کو فیکٹری میں ڈھالنے والے اوزاروں سے ناپتے ہیں۔ صحیح الدماغ وہ ہوتے ہیں جو انسانی اقدار اور سکّوں میں امتیاز کرنا جانتے ہیں۔

باجی! مجھے محمود صاحب سے دشمنی تو نہیں۔ ہوسکتا ہے وہ اچھے بھلے آدمی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جذبات اور سرد یخ بستہ دھات کا فرق بھی محسوس کرتے ہوں۔

لیکن بات تو جب ہوتی نا، کہ آصف بھیّا! آصف بھیا...... کی...... وہ انگوٹھی میرے پاس نہ ہوتی۔

ہمارے اور ان کے درمیان وہ عہد نہ ہوتا۔ جس نے سونے اور چاندی، زماں و مکاں کے سارے فرق کو مٹا دیا ہے۔

باجی دو سال میں کیسے فراموش کرسکتی ہوں جو میری زندگی کا حاصل ہیں۔ حیات کا سرمایہ ہیں۔ باجی یہ دو سال تو میری ساری زندگی کے لئے کافی ہیں۔ اس دو سال کے لئے تو میں دو صدی انتظار کرسکتی ہوں۔

باجی! تم کہتی ہو کہ برا ہوا اس لمحے کا جب یہ منحوس جذبہ میری زیست کا حاصل بنا۔

ایسا نہ کہو باجی! وہ لمحہ...... وہ لمحہ...... اگر میری زندگی...... میں نہ آتا...... تو میرے خدا! پھر کیا ہوتا۔ اسی لمحے نے تو حیات کا حوصلہ بخشا ہے۔ زندگی کا جذبہ ابھارا ہے...... اسی لمحے نے وہ متاع حیات بخشا ہے۔ جس کا سرور اس غم والم کی تاریکی میں نور بن کر جگمگا رہا ہے۔

باجی تم کہتی ہو کہ یہ سب کیونکر ہوا۔ کیسے ہوا۔ آصف تو پڑھنے آئے تھے۔ درس و تدریس میں یہ عشق کا درس کیا معنی۔

باجی! یوں نہ کہو! تم کیا سمجھتی ہو! اس عشق نے مجھے ہوش سے بیگانہ نہ کر دیا ہے۔ اسی محبت نے فرزانگی کے سارے دروازے بند کر دیئے ہیں۔

نہیں باجی! نہیں — تم کیا جانو...... کہ چاہنا اور چاہے جانے کا جذبہ وہ گراں قدر جذبہ ہے جو بے ہوش کو باہوش بناتا ہے۔ اگر آصف میری زندگی میں نہ آئے...... تو پتہ نہیں میری ذہنی تزلزل وغیر یقینی حالات مجھے کب دیوانگی کے دوراہے پر لا کھڑا کرتی۔

باجی تمہیں یاد ہوگا، تم نے ہمیشہ مجھے قنوطی کہا، اکثر تم کو میں نے کہتے سنا ''ارے اس لڑکی کے سر میں کیا سودا سوار ہو گیا ہے۔ ہر شئے کے برے پہلو کو ہی دیکھتی ہے۔ اپنے لئے کسی اچھی بات کی توقع رکھتے ڈرتی ہے۔ تم مجھے کہتی ہو کہ تم اپنے مقدر سے خائف کیوں رہتی ہو۔

''باجی! تمہیں یاد ہے نا'' میں نے تم سے کہا تھا۔ باجی! تم کیا جانو۔ خوشیاں بھی میرے پاس سہم سہم کے آتی ہیں۔ سسکتی کراہتی ہوئی — اور تم نے اس کی تفصیل دریافت کی تھی۔

تفصیل میں کیا بتاتی، تم تو جان کے بھی انجان بنتی ہو۔ کچھ لوگ تجاہل عارفانہ کے عادی ہوتے ہیں۔ کیا تم نے میرے ساتھ آنسو نہیں بہائے ہیں؟ — کیا میرے شب و روز تم سے پوشیدہ ہیں، باجی؟''

''میری حیات کے لمحے کی تم رازداں ہو، باجی — میں بچپن ہی سے حساس تھی، سچ پوچھو تو احساس کی زیادتی ہی نے یہ قیامت ڈھائی ہے۔

ابو کچھ ایسے تنگ حال بھی تو نہ تھے کہ میں ابو سے ضرورت کہتے جھجکتی۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل کی ضدیں نہ کرتی۔ لیکن اب یہ میری بیوقوفی کہو یا وہ جذبۂ ستائش کہ اچھے کہے جانے کی خواہش کہ — کبھی ابو سے کھل کے کوئی خواہش کیا۔ کسی بچکانہ اُمنگ کا بھی اظہار نہ کیا۔

مجھے یاد نہیں پڑتا باجی! کہ کبھی میں نے کسی پانچ روپے کے کھلونے کے لئے ابو سے ضدیں کی ہوں، امّی کو تنگ کیا ہو۔

باجی تم اکثر مچل جایا کرتیں۔ ابو الجھتے، امی ڈانٹتی اور میں اس وقت اپنے سر اٹھاتے

خواہش کو دبا کر بڑی مسرت محسوس کرتی —— لیکن باجی، شاید تمہارا ہی رویہ درست تھا۔ گھٹن بڑی بری شئے ہے باجی!''

اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا گلا گھوٹنا نہیں چاہیئے۔ باجی —— لیکن کتنی بڑی اذیت —— اسی نے میری ساری زندگی مغلوب رکھا۔ وقتی تعریف کی خواہش، لمحاتی ستائش —— لیکن کتنی بڑی اذیت۔

باجی! مجھے تو اب ہنسی آتی ہے —— خیر اب تو میری ہنسی کی بات نہ کرو —— اب تو ابو میرے ہنسنے سے خائف رہتے ہیں۔ حالانکہ مجھے بے وجہ ہنسی نہیں آتی۔ میں یہ ساری باتیں سوچ کر ہنستی ہوں۔

ہاں! تو میں کیا کہہ رہی تھی —— میرا احمق پن دیکھو کہ اسکول یا کالج کی فیس مانگنے سے پہلے دو دن فکر کو گلے لگا رکھتی۔ کس طرح ابو کو پریشان کرتی۔ کیا ہوگا ہم لوگوں کے ساتھ خرچ کر کے۔ گھنٹوں سوچتی، شرمندہ ہوتی۔ عجیب ذہنی تکلیف تھی۔ میری، ایسی ہی گھٹن وانتشاری دور میں۔ میں نے میٹرک کا امتحان دیا۔

باجی! کیا کہوں۔ کیا وہ زمانہ بھی تھا۔ سکنڈ ڈویژن پاس کیا تھا۔ ہنگامہ غلط ہو گیا کہ فرسٹ ڈویژن آرہا ہے۔ گھر والوں نے خوب خوب شاباشی دی۔ یوں کہ سکنڈ ڈویژن آتا تو بڑا برا ہوتا —— ابو نے کہا کہ تم نے میری لاج رکھ لی۔ سر بلند کیا وغیرہ......

اور پھر رزلٹ معلوم ہوا کہ سکنڈ ڈویژن ہی آیا اور میں منہ لپیٹ کے پڑ رہی اور میرے کانوں میں کوئی کہنے لگا —— ''سکنڈ ڈویژن آتا تو بڑا برا ہوتا۔ تو نے تو میری لاج رکھ لی۔ سر بلند کیا'' اور گھر میں عجیب سوگواری کیفیت۔

''یاد آیا باجی تمہیں!'' میری تو نگاہوں میں سنیما کے پردے پر آنے والی تصویروں کی طرح سارے واقعات آتے ہیں۔

جب ہی تو میں کہتی ہوں کہ میرے دامن میں جو مسرّتوں کے گل بھی ہیں تو پژمردہ

پژمردہ، زرد زرد سے۔

پھر ایک ہی واقعہ کو کیوں لیتی ہو۔ آئی۔ایس۔سی میں کیا ہوا تھا۔ تم کہوگی وہی ایک قصہ ——ہاں! باجی۔ اس وقت زندگی میں میری ذاتی مسرت والم تو یہی تھے نا — اور سچ پوچھو تو شخصیت کے بننے اور بگڑنے میں اسی دور کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ باجی۔ وہی تو تعمیر اور تشکیل کا وقت ہوتا ہے۔

"کیوں غلط تو نہیں کہی"، نہیں...... نہیں! بھلا تم کو مجھ سے کہاں اتفاق ہوگا۔ تم تو سمجھتی ہو کہ میں اوٹ پٹانگ کہتی ہوں۔ تب ہی تو، جب میں بولتی ہوں تو تم گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگتی۔ باجی! تم سمجھتی ہو کہ میں ہوش میں نہیں ہوں۔

سچ پوچھو تو میں نے کون سی ہوش سے بیگانگی کی باتیں کی ہیں۔ میں سب سمجھتی ہوں، تم، ابو اور امی مجھ سے الگ ہٹ کر سرگوشیاں کرتے ہیں۔ مجھے سب خبر ہے۔ کسی کسی وقت میرا ذہن الجھتا ہے۔ ورنہ مجھے کیا ہوا ہے۔ باجی! لوگ مجھ سے لفافہ چھپاتے ہیں۔ ہاہاہا!

بتاؤ تو، اس میں میرا ہنسنے کو جی نہ چاہے تو کیا ہو۔ کل ابو کے کمرے میں گئی تو میں نے دیکھا ابو نے جلدی سے کسی کاغذ کو میز پوش کے نیچے ڈال دیا۔

باجی جانتی ہو! پھر کیا ہوا۔ مجھے کرید لگ گئی۔ پاگلوں کی طرح (خدانخواستہ میں پاگل کیوں ہونے لگی) میں موقع کی تاک میں لگی رہی اور میں نے آج موقع ڈھونڈھ ہی لیا۔ وہ لفافہ آصف بھیا کا تھا۔ جو چار سو کماتے ہیں۔ جو ابو کی لاڈلی بیٹی کی آنچل میں چاند ستارے نہیں ٹانک سکتے۔ کیونکہ چار سو کمانے والا اپنے دامن میں سیہ بختیاں تو لاسکتا ہے۔ چاند ستارے نہیں —— اسی آصف بھیا نے ابو کو ٹیلیگرام کیا تھا کہ خدا کے فضل سے، ابو کی دعاؤں سے انہوں نے بی۔پی۔ایس (B.P.S) کمپلیٹ کیا ہے اور اسی لئے ابو نے وہ لفافہ مجھ سے چھپا دیا۔ کیوں نہ چھپاتے، میرے ہاتھوں میں تو محمود صاحب کے یہاں کی آئی ہوئی طلائی بیڑیاں ڈالی جا چکی ہیں نا۔

ان انگلیوں کو تو میں نے فگار کرلی، جس میں آصف بھیا کی اسٹیل کی انگوٹھی تھی۔

باجی! وہ انگلی بہت دکھتی ہے۔ کل تم نے مجھے ایک چانٹا مارا۔ کیونکہ میں نے اپنی اس انگلی کو دانتوں سے چپا ڈالا تھا۔ باجی! تم یقین کرو، میں بالکل ہوش میں تھی۔ بس وہ انگلی مجھے بڑی تکلیف دیتی تھی۔ شاید اسٹیل کی انگوٹھی کچھ تنگ ہوگئی۔ میں چاہتی تھی کہ دانتوں سے کاٹ کر اتار ڈالوں۔ لیکن وہ اتری نہیں تھی۔

باجی! میں کیا کروں تم نے سمجھا کہ میں بدحواسی میں ایسا کر رہی ہوں۔

ہاں! تو باجی اس انگوٹھی کا واقعہ تو میں نے تمہیں سنایا ہی نہیں —— آصف بھیا گھر میں یوں رہتے کہ ان کا وجود نا وجود برابر تھا — باجی! اس زمانہ میں تم سسرال میں تھی۔ گھر کاٹنے دوڑتا۔ آصف بھیا، ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھے۔ امی گھر کی مصروفیت میں پریشان رہتیں۔ تمہارے جانے سے سارا بوجھ تو امی پر پڑ گیا تھا۔ میں بات کرنے کو ترستی۔ کبھی آصف بھیا کے کمرے میں جاتی۔ کسی ضرورت کے تحت کمرہ وغیرہ درست کرنا ہوتا۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جب میں آصف بھیا کی طرف دیکھتی تو وہ کسی دوسری طرف دیکھنے لگتے اور جب میں ان کی طرف سے نظر ہٹا لیتی تو وہ میری طرف دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں کچھ ایسی بات تھی باجی، کہ ان کی نگاہیں سرور بن کر میری رنگ و پے پر چھا جاتیں۔ محبت کا نشہ ہو جاتا۔

ایک دن کی بات ہے۔ میں باورچی خانے میں تھی۔ امی پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ خلاف معمول آصف بھیا دوپہر میں آ گئے۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ شاید سناٹا محسوس کر رہے تھے۔ باورچی خانہ میں مجھے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا باجی، کہ وہ بڑے مسرور ہوئے۔ شاید پہلی بار وہ کچن میں چلے آئے تھے۔ میں روٹیاں پکا رہی تھی۔ گھبرا سی گئی۔ انہوں نے میری گھبراہٹ کو محسوس کیا۔ مسکراتے ہوئے پوچھا "خالہ امّی کہاں ہیں؟" "آپ تنہا کیوں ہیں؟"

"امّی پڑوس میں گئی ہیں۔ آپ خلاف معمول سویرے آ گئے"۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔

"جانتا کہ آپ تنہا ہیں تو سڑکوں پر وقت نہ بیتاتا۔ آج کلاس سویرے ہی سسپنڈ ہو گیا تھا۔ میں وقت گذاری کے لئے سڑکیں ناپتا رہا" وہ پیڑھا گھسیٹ کا بیٹھ گئے"۔ میں سوچتی رہ گئی۔

بڑی دیر خاموشی رہی۔ان کی نگاہوں کی تپش میں رخساروں پر محسوس کرتی رہی۔''چائے پیئیں گے''
میں نے گھبرا کر پوچھا۔''ضرور آپ پلائیں اور میں نہ پیوں''۔انہوں نے کہا تو بہت آہستہ سے تھا۔
لیکن اتنی اونچی آواز تو تھی ہی کہ میں سن لیتی۔ میں نے انہیں چائے بنا کر دی۔ چائے لیتے ہوئے
انہوں نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا کہ جو نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ جاتی ہیں اور میں زبان
سے سننے کی متمنی بھی نہ تھی۔

باجی! بہت سے ایسے جذبے ہوتے ہیں جو اَن کہے ہی بھلے لگتے ہیں۔ میں نے
آصف بھیا کے اس جذبے کو روزِ اوّل ہی پڑھ لیا تھا۔

ایک دن باجی! میں نے آصف بھیا کے ٹیبل پر ایک نئی سی ڈائری دیکھی۔ میں نے
متجسس نظروں سے اس ڈائری کو اٹھا لیا۔اس ڈائری کے بیچ میں ایک خوبصورت سی سُرخ نگوں کی
اسٹیل کی انگوٹھی تھی۔ اور اس ورق پر دو لائن لکھا تھا!— اس انگوٹھی کو قبول کر لیجئے۔آپ کی اس
قبولیت سے بہت سے اَن کہے جذبات کو زبان ملے گی۔اس ماہ کے آخر تک میں چلا جاؤں گا۔
پھر اگر قسمت نے چاند تک پہنچنے کے قابل بنایا تو پھر آپ کو حاصل کرنے ضرور آؤں گا......

آصف

میرا دل دھڑ کنے لگا باجی۔ میں جانتی تھی۔آصف بھیا کا امتحان ہو گیا۔میری نگاہوں
میں ان کا ملتجی چہرہ گھومنے لگا۔پھر میرا دل مسرّتوں کے اَتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔محبت نے روح
تک کو سرشار کر دیا۔میں نے چپکے سے انگوٹھی مٹھیوں میں دبالی اور دھڑ کتے ہوئے دل سے کمرے
سے نکلنا چاہا کہ آصف بھیا سامنے کھڑے نظر آئے اور میں گھبرا گئی۔آصف بھیا کی مسرور نگاہیں
میرے ہاتھوں پر تھیں۔

''کیا اسے، ان مخروطی انگلیوں تک پہنچنے کا شرف نہ ملے گا''انہوں نے بڑے التجائی
لہجے میں کہا۔

باجی سچ پوچھو تو ان کی شرافت نے میرا دل موہ لیا۔ایسی تنہائی کے ماحول اور اس

جذبے کے اثر سے بہت ساری بدتہذیبیاں بھی روا تھیں۔ لیکن انہوں نے کبھی نازیبا بات نہ کی۔ اکثر امّی ابو گھر میں نہ رہتے۔ انہوں نے کبھی اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔

میں نے چپکے سے انگوٹھی پہن لی ——— ''دعا کیجئے۔ خدا مجھے آپ کے قابل بنا دے۔'' بڑے جذباتی لہجے میں انہوں نے کہا۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ ان کی نگاہوں میں عزم وحوصلے کی شمعیں روشن تھیں۔

اسی ہفتہ آصف بھیا چلے گئے۔ ابو کے نام خط آتے رہے اور پھر...... پھر باجی! مجھے معلوم ہوا کہ آصف بھیا کو ٹاٹا فرم میں کوئی کام مل گیا۔ آصف بھیا نے ابو کو یہ بھی تو لکھا تھا کہ فی الحال انہوں نے اس جوب (Job) کو تھام لیا ہے۔ لیکن ابو...... نے شاید انہیں کبھی قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ حالانکہ ابو کو میرے جذبات کا علم تھا۔ اس علم نے ہی شاید انہیں عجلت پر امادہ کیا۔ باجی! عجلت کی سزا ضرور ملتی ہے اور اب ابو کیا کہتے ہیں: ——— آصف بھیا نے مقابلے کا امتحان پاس کیا ہے۔ اب وہ چاند تک پہنچنے کے قابل ہو چکے ہیں۔

آپ نظریں کیوں چراتی ہیں۔ ابو کہتے ہیں کہ اگلے ماہ شادی کی تاریخ پڑ چکی ہے۔ اب ان کے ہاتھ کٹ چکے ہیں۔ میری کلائیوں میں طلائی زنجیریں ڈالی جا چکی ہیں۔

اور اب باجی! میں ہنستی ہوں تو ابو خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور روتی ہوں تو امی دروازے بند کرنے لگتی ہیں اور باجی! شاید، تم لوگ مجھے کہیں لے جانا چاہتی ہو''۔ ''کہاں لے جاؤ گی باجی؟'' میں کہیں نہیں جاوں گی۔ میں بالکل ہوش میں ہوں۔ بس کسی کسی وقت قہقہہ مار کر ہنسنے کو جی چاہتا ہے اور سینہ پیٹ پیٹ کر رونے کو......

یہ سب تو میرے حسب حال ہیں باجی! قدرت کی ستم ظریفی پر ہنستی ہوں۔ اپنی تیرہ بختی پر روتی ہوں اور تم کہتی ہو کہ محمود صاحب کو کانوں کان خبر نہ ہو—— چپکے سے ابو رانچی لے جائیے۔

نہیں خدا کے لئے نہیں باجی! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں اچھی بھلی ہوں۔ بس کبھی کبھی میرا

جی چاہتا ہے کہ اپنے سامنے جو آئے اس کا منہ نوچ لوں۔ دھنکی سے پیٹ ڈالوں۔ لیکن باجی! بے وجہ تو نہیں۔ آخر ایسی عجلت تھی ابو کو، کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ یہ سب سازش ہے۔ خواہ مخواہ کی دل آزاری، خدا دل آزاری کو کبھی معاف نہیں کرتا۔

باجی!'' کہو'' امی کو دروازے بند کر دیں۔ سینہ پیٹ پیٹ کر رونے کو دل چاہ رہا ہے۔

☆☆

دل

سارے گھر میں ہُو کا عالم تھا۔صبح سے کسی کے منہ میں ایک کھیل بھی نہ پڑی تھی۔ دونوں چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔سارے نوکر دائی سب افسردہ اِدھر اُدھر بیٹھے تھے۔ارشد بھیا کے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا۔اندر موت وحیات کی کشمکش تھی۔زیست موت سے لڑے لڑتے تھک سی گئی ارشد بھیا بڑی دھیمی دھیمی سانس لے رہے تھے۔ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ ان کے دل کا فعل ٹھیک نہیں ہے۔خالہ جان صبح سے سجدے میں پڑی تھیں۔بوا جنہوں نے ارشد بھیا کو دودھ پلایا تھا۔چوکھٹ پر سر رکھے ارشد بھیا کی زندگی کی بھیک خدا سے مانگ رہی تھیں۔پروین کا دل قابو میں نہ تھا۔وہ بار بار ارشد بھیا کے کمرے میں جھانک آ گی۔خالو ابا کو ٹیلیگرام جا چکا تھا۔انور صدر ہاسپٹل جا چکے تھے۔جب تک انور صدر ہاسپٹل میں ہیں۔ارشد بھیا کی حالت دوبارہ نہ بگڑے، پروین خدا سے دعا مانگ رہی تھی۔وہ چپ چاپ ارشد بھیا کے کمرے سے نکلی۔ہر بار وہ ایک نئی امید لے کر کمرے میں جھانکتی۔لیکن پہلے سے زیادہ مایوسی و دل گرفتہ نکلتی۔وہ صحن میں تھکی تھکی سی بیٹھ گئی۔اس کا سر بوجھل تھا۔دماغ پریشان۔بہت سارے خیالات کے ہجوم نے اسے آ گھیرا۔

ارشد بھیا.........اس کے دل کی دھڑکن کہیں تیز ہوگئیں۔ان کے ذکر پر اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو جاتیں کانوں میں شہنائیاں سی گونج اٹھتیں۔دل میں بڑی ہلکی ہلکی سی گدی گدی ہونے لگتیں۔ارشد بھیا اُسے......اُسے ایسا لگتا جیسے ان کے تصور کے بغیر وہ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہ گذار سکے گی۔اس تصور کے بغیر اس کی اپنی زندگی کا کوئی تصور بھی نہ تھا، اسے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا کہ جب اس کی امی کے مرنے کے بعد خالہ جان اسے اپنے گھر لے آئیں تھیں۔ وہ تین چار سال کی ننھی سی بچی سہمی سہمی سی ان کے پہلو میں بیٹھی تھی۔آٹھ نو سال کے ارشد بھیا ہاتھوں میں گیند لئے گھر میں داخل ہوئے۔امی کے پہلو میں اسے دیکھ کر پہلے ٹھٹکے۔گھنگھریالے بالوں والی اور سہمی سہمی آنکھوں والی یہ لڑکی بڑی پیاری لگی۔وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آئے۔ یہ کون ہے امّی ؟ یہ تیری دلہن ہے بیٹا۔وہ بہت خوش ہوئے۔اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔یہ اب یہیں رہے گی امّی ؟انہوں نے امی سے پوچھا۔اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور خالہ جان کے پہلو سے لگ گئی۔ جاؤ، بیٹا یہ تمہارا بھیا ہے۔اس کے ساتھ کھیلو۔انہوں نے اسے چمکارا۔اس نے ارشد بھیا کی طرف دیکھا۔خاکی ہاف پینٹ۔سفید شرٹ، ہاتھوں میں گیند لئے، سارے بال پیشانی پر بکھرے وہ اسے بڑی دوستانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔انہیں اپنی یہ ننھی دوست بڑی اچھی لگ رہی تھی۔وہ ارشد بھیا کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ارشد بھیا نے اپنے سارے کھلونے اسے دے دیے۔انہوں نے انور کے بھی سارے کھلونے اسے دے دیئے۔پھر انور نے اپنے سارے کھلونے چھین لئے۔پھر ارشد بھیا انور سے کھلونے چھیننے لگے۔انور نے کچکچا کے ارشد بھیا کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے۔سرخ سرخ خون ارشد بھیا کی کلائی سے بہتا دیکھ کر وہ رونے لگی۔وہی تاثر اب بھی قائم تھا۔انور سے اس کی اب بھی نہیں بنتی تھی۔

مہینہ سال کی گردشوں نے بہت ساری تبدیلیاں لائیں۔وہی ارشد بھیا جن کے وہ ہمیشہ پیچھے پیچھے لگی رہتی۔انور اسے مارنے دوڑتا تو وہ ارشد بھیا کے پیچھے چھپ جاتی۔جب ارشد بھیا اسکول جانے لگتے وہ ان کے ساتھ جانے کے لئے ضدیں کرنے لگتی۔ارشد بھیا خوش خوش

اسے ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہو جاتے۔ خالہ جان اسے سمجھاتی بجھاتیں۔ اب ارشد بھیا کے سامنے جانے سے وہ ہچکچاتی۔ کبھی سامنا ہو جاتا تو وہ مجوب مجوب سی کھڑی رہ جاتی۔ وہی ارشد بھیا جن سے وہ باتیں کرتے نہ تھکتی۔ اب ان کی طرف دیکھتے بھی شرماتی۔ ارشد بھیا بھی اب اسے کچھ فرمائش کرتے ہچکچاتے۔ پہلے وہ اپنی ضرورت کے لئے اسے پکارتی اب وہ ارشد بھیا کے سامنے ہونے سے گھبراتی تھی۔ اس کے قرب سے اسے تسکین بھی ملتی۔ خالہ امی اکثر چائے وغیرہ اسی کے ہاتھ سے بھیجتیں۔ کاموں میں الجھی الجھی رہتیں تو اس سے کہتیں جاؤ بیٹی ذرا ٹرے اٹھا کر ارشد کے ٹیبل پر رکھ آؤ۔ سمیع مردود پتہ نہیں کہاں نکل گیا۔ وہ جھجکتی شرماتی ٹرے لئے ان کے کمرے میں پہنچتی۔ ارشد آرام کرسی پر لیٹے کوئی کتاب پڑھتے ہوتے۔ میز پر کچھ رکھنے کی آواز سے چونکتے۔ اسے دیکھ کر گھبرا کر کھڑے ہو جاتے۔ آپ نے کیوں لایا۔ وہ کچھ نہ بولتی اس کی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کر لیتیں۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چھلک اٹھتیں۔ جلدی جلدی چائے بنا کر پیالی ان کے آگے سرکاتی۔ وہ جانے کے لئے مڑتی "کیوں آپ نے چائے پی لی"۔ ایسا لگتا جیسے ارشد بھیا اسے روکنا چاہتے ہوں۔ "جی ہاں" پہلی بار اس نے نظریں اٹھائیں۔ گہری گہری سیاہ آنکھیں محبت کی جوت سے چمکتی ہوئی اسے تکتیں۔ وہ بھاگ کھڑی ہوتی۔

انور ہمیشہ اس کی محبت کا مذاق اڑاتے۔ اتنی ہمت تو اس میں نہیں تھی کہ وہ ارشد بھیا کے سامنے اسے کچھ کہتے۔ لیکن ان کے پیچھے وہ اس کا مذاق ضرور اڑاتے۔ اسے خاموش کبھی بیٹھا دیکھتے تو کہتے۔ "اُفوہ کسی خیالی دنیا کی سیر ہو رہی ہے۔ بھائی" واہ کیا روگ پالا ہے آپ لوگوں نے۔ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے۔ بھیا کا بھی وہی حال، گھنٹوں آرام کرسی پر آنکھیں موندے لیٹے ہیں۔ کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ خوش قسمتی سے وہ آپ ہوئیں۔ آنکھوں کو نئی جوت مل گئی۔ اس وقت تک نظریں تعاقب کرتی رہتیں۔ جب تک سایہ بھی نظر آتا رہا۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ بڑا منہ پھٹ ہے یہ انور بھی، مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ کہیں یہ ان کے سامنے کچھ نہ کہہ بیٹھے۔ لیکن انور، ارشد بھیا کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے۔ ان کا بڑا رعب تھا۔ سبھوں پر اس وقت تک اس نے ارشد بھائی کو کسی پر بگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ ہمیشہ سبھوں سے نرمی سے باتیں کرتے۔ ملازم بھی ان سے خوش تھے۔ ان کا کام دل و جان سے کرتے اور انور ان سے تو سب پناہ مانگتے۔ نئے نوکروں کا دو تین دن خیال کرتے پھر وہی ڈانٹ ڈپٹ، ارے مردود یہ کام کیوں نہیں کیا۔ کاہلوں کی طرح بیٹھا، جمائیاں لے رہا ہے۔ کیا رات بھر کام کرتا رہتا ہے۔ بوا کیا ہر وقت جوئیں نکالتی رہتی ہو —— آج سے باورچی خانہ میں قدم نہ رکھنا —— خالہ جان بھی ان سے عاجز تھیں۔ جس سے کہہ دیا کہ باورچی خانہ میں نہ جاؤ۔ کیا مجال جو پھر وہ کبھی بھولے سے بھی چلا جائے۔ خون خرابہ کر دیتے۔

خالہ جان بیچاری کی جان پر مصیبت۔ خالہ جان چاہتی تھیں کہ ارشد کے ساتھ انور کی طرف سے بھی سبکدوش ہو جاتیں۔ لیکن ان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ انور شادی کے ذکر سے آگ بگولہ ہو جاتے۔ امی اب جو بولیں آئندہ پھر کبھی نہ بولئے گا۔" بدتمیزی کی حد تک شوخ تھے۔ "شادی میں کروں گا نہیں" —— شادی وادی کیا ہوتی ہے۔ سو نخرے برداشت کرو۔ زندگی کو کسی کا پابند بنا کے رکھ دو —— کوئی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ دس بجے گھر پہنچ جائیے —— کسی نے میرے لئے کھانا نہیں کھایا —— ہوٹل کا منہ نہ دیکھئے —— راہ میں لذیذ سے لذیذ چیزیں کھانے کو ملیں۔ لیکن بندہ اس طرف نظریں نہ کرے نہیں تو —— روتے روتے دامن اور ساری کا پلہ ایک کر دے گی وغیرہ وغیرہ......... اس لئے امّی مجھے بخشئے —— میں اچھی بھلی زندگی میں یہ روگ لگانے والا نہیں —— آپ بھیا کے ساتھ اپنے ارمان پورے کیجئے ——

خالہ جان جوان کی باتوں سے الجھتی رہتیں۔ صرف اتنا کہتیں "لو وہ کیا تمہاری طرح نافرمان ہے، جو میں کہوں گی وہی کرے گا۔" وہ بڑی ارمانوں سے اس کی طرف دیکھتیں۔ وہ شرم سے گردن نہ اٹھا پاتی —— "ارے امی آپ کیا جانیں۔ جو آپ کہیں گی وہ ان کے دل کی لگی ہوگی"

انور شرارت سے ہنستے ''چل ہٹ'' خالہ جان، اپنی مسکراہٹ کی آڑ میں اسے ایک دھپ جماتیں۔ اسی وقت ارشد بھیا آ گئے۔ انور یہ جا وہ جا — وہ کہیں بھاگ ہی نہ سکی۔

خالہ امی تو موقع کی تلاش ہی میں تھیں۔ انہیں ارشد سے تنہائی میں پوچھنے کا موقع نہ ملتا۔ ان دنوں کالج میں لکچرار ہو گئے۔ بہت کم گھر میں رہتے۔

''بیٹا! اب میں چاہتی ہوں کہ تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں'' ارشد بھیا ان کے قریب تخت پر بیٹھ گئے۔

''گھر کی لڑکی ہے۔ ڈھونڈھنے کا بھی کوئی سوال نہیں اٹھتا۔'' خالہ جان کہے جاتی تھیں۔ اس کی تو یہ حالت کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ وہ اٹھ کر بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ ''کیوں بیٹا؟ تم کیا کہتے ہو؟'' خالہ جان جواب سننے کو بے چین تھیں۔ ارشد بھیا سر جھکائے بیٹھے ''جو آپ کی مرضی امّی'' جیتے رہو۔ خوش رہو۔ خالہ جان سچ مچ بہت خوش تھیں۔ باورچی خانہ میں شاید کوئی برتن کھڑکھڑایا اور خالہ جان ہے! ہے!! کرتی ہوئی اس طرف چلی گئیں اور پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔

تنہائی کے احساس سے وہ محجوب سی ہو گئی۔ ''پروین'' ارشد بھیا نے اسے دھیرے سے پکارا۔ وہ کچھ نہ بول سکی۔ ''اپنی رضامندی دے کے میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی ہے۔'' وہ کیا بولتی۔ ''بولئے پھر امّی آ جائیں گی۔ پھر آج سے شاید وہ ہم لوگ کا پردہ بھی کرا دیں۔'' ارشد بھیا جواب سننے پر مصر تھے۔

''میں آپ کا عندیہ لینا چاہتا ہوں''۔ اس کے منہ سے کچھ نکل نہ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ارشد بھی اٹھ گئے۔ وہ بالکل مقابل کھڑے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں نے اس کے قدم جکڑ دیئے۔ وہ متوحش سی ہو گئی۔ ''کہیئے'' وہ جانتی تھی کہ ارشد بھیا کا ایک اصول ہے۔ وہ بغیر مرضی لئے ہرگز شادی نہ کریں گے۔ ''میں کیا کہوں''۔ اس کا گلا خشک ہوتا جاتا تھا۔ ''امی جو چاہ رہی ہیں۔ وہ اس کی خواہش کے مطابق ہے۔'' کیسا سوال ہے؟ ہائے! اللہ کیا جواب دے۔ ''جی'' کہہ کے وہ یہ جا وہ جا۔

اس نے اپنے کمرے سے جھانک کے دیکھا۔ ارشد بھیا بہت دیر تک اسی حالت میں وہاں کھڑے رہے۔ کھوئے کھوئے سے۔ خالہ جان شادی کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک صبح ارشد بھیا کو دل کا دورہ پڑا۔ وہ گھر جہاں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں وہاں صف ماتم بچھ گئی۔ ڈاکٹر نے مایوسی ظاہر کی۔ صحن میں بیٹھے بیٹھے وہ اُونگھ سی گئی تھی۔ باہر بڑے زور کا شور سنائی دیا۔ وہ چونکی، محلے کے چند بچے اور عورتیں شور مچاتے آنگن میں چلے آئے۔ انور بھیا کا ایکسڈ یںنٹ ہو گیا۔ "کیا!" اسے ایسا لگا جیسے چھت اس پر گر پڑی ہو۔ خالہ جان اور وہ دوڑتی ہوئی دروازے پر چلی گئیں۔ انور کو ٹرک سے اُتارنے کے لئے اسٹریچر بھیجا گیا۔ مردے کی طرح وہ چارپائی پر لدے، اترے، اس نے اس کی طرف دیکھا اور بیہوش ہو گئی۔

پتہ نہیں، وہ کتنی دیر بیہوش رہی۔ ہوش آنے پر اس نے دیکھا۔ صحن مہمانوں سے بھرا ہے۔ انور کا انتقال ہو چکا تھا۔ ارشد بھیا کو ہاسپیٹل بھیج دیا گیا تھا۔ اس کے ذہن نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو دیا تھا۔ کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ اس نے نظریں گھومائیں۔ خالو جان تھے۔ وہ آ گئے۔ شاید وہ سیدھے خالہ جان کے پاس آئے۔ ہوش سنبھالو تو سنو۔ وہ خالہ جان سے کہہ رہے تھے۔ میں تم سے ایک مشورہ لینے آیا ہوں۔ خالو جان کی آواز تھرا رہی تھی۔ خالہ جان۔ آنکھیں کھول دیں ــــــ انور تو اس دنیا سے جا ہی چکا۔ ارشد کی زندگی چاہتی ہوں" خالو جان نے گرفتہ آواز میں کہا۔ خالہ جان کچھ کہہ نہ سکیں۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیا ــــــ "اے میرے خدا!" اس کے سوا ان کی زبان سے کچھ نہ نکل سکا۔ خالو جان ان کی اس حالت سے بہت متاثر ہوئے۔ دو آنسو ان کی پلکوں سے ٹپک پڑے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے۔ "اگر انور کا دل ارشد کے دل کی جگہ رکھ دیا جائے تو ارشد بچ جائے گا۔ تمہاری اجازت کی ضرورت ہے"۔ خالہ جان نے اپنے دل کو پکڑ لیا۔ کیا میرے لال کا دل چیر کر نکال لیا جائے گا۔

آخر تو اس کا پوسٹ مارٹم ہونا ہی ہے۔" خالہ جان کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ سنو وقت بہت کم ہے۔ تم دونوں کو کھو دو گی۔" جو آپ کا جی چاہے کیجئے"۔

خالہ جان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ خالو جان باہر چلے گئے۔ وہ یہ سب سنتی رہی۔ وہ صرف سنتی اور دیکھتی رہی۔ اس کا ذہن مفلوج تھا۔ وہ ارشد اور انور کے ساتھ پل کر جوان ہوئی۔ دونوں ہی سے اسے بے پناہ محبت تھی۔ ارشد اس کے جیون کا ساتھی تھا اور انور............ اس کا دوست تھا۔ اس کا بھائی تھا...... اس کا پیارا دیور تھا۔ اس کی قہقہوں اور شوخیوں کے درمیان اس نے اپنے مستقبل کا خواب دیکھا تھا۔ اسے اپنے چھوٹے سے گھر میں ہر طرف انور کے قہقہوں کی گونج سنائی دیتی تھی۔ آہ! انور پیارا۔ انور زندہ دل، ہنسوڑ، محبت کا مذاق اُڑانے والا، پابندیوں سے گھبرانے والا جیسے زندگی کا اس قدر بھرپور لطف اٹھانے کا ارمان ہو، وہ زندگی سے روٹھ جائے۔ اُف میرے خدا اس کا دل روتا رہا۔

وہ شاید روتے روتے سوگئی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خالہ جان کو اپنے قریب پایا۔ وہ ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں، اس کو آنکھیں کھولتا دیکھ کر خالہ جان سے اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ خدایا تیرا ہزار ہزار شکر ہے۔

"کیوں خالہ جان" وہ دھیرے سے بولی۔ "دوروز سے تمہاری حالت غیر رہی بیٹا" وہ اٹھنے لگی۔ خالہ جان نے دھیرے دھیرے سے اسے اٹھایا۔ خالو جان بھی اس کے قریب بیٹھے تھے۔ اس نے مسدود نظروں سے خالو جان کی طرف دیکھا۔

ارشد اچھے ہیں بیٹی، انور کو سپرد خاک کیا جاچکا ہے۔ خالو جان نے دھیرے سے کہا"۔ میرے انور کا دل ارشد کے سینے میں دھڑک رہا ہے۔ خالہ جان نے کہا، چلو! تم اسے دیکھ لو۔ میرا بچہ اب اچھا ہے۔ وہ ارشد کے کمرے کی طرف آئی۔ ارشد بھیا بستر پر تکیوں کے سہارے لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ چہرے سے صحت مندی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ چپ چاپ ان کے پائینتی کھڑی ہوگئی۔ اس کی عجیب کیفیت تھی۔ یہ سوچ کر کہ انور کا دل ارشد کے سینے میں دھڑک رہا ہے۔ یہ سوچ کر اسے اچنبھا سا لگ رہا تھا۔ خالہ جان کا دونوں بچہ ان کے پاس ہے۔ "دل" جس کے بغیر زندگی کے ایک لمحہ کا بھی تصور نہیں ہے وہ تو انور چھوڑ گیا۔ صرف جسم لے گیا۔ جسم ایک بچہ کا

دل دوسرے بچہ کا یعنی جسم ارشد کا روح انور کی۔ وہ ساکت و جامد سوچے جا رہی تھی۔ ارشد بھیا نے چونک کے اسے دیکھا۔ خالہ جان بیٹے کے قریب بیٹھ گئیں ——— خدایا! تیرا ہزار ہزار شکریہ کہ تو نے یہ دن دکھایا۔ ہم تو دونوں سے مایوس تھے۔ بلا سے ایک آنکھ کا نور چلا گیا۔ دوسری آنکھ کے نور سے زندگی بیت جائے گی۔ اب خدا سے یہی دعاء ہے۔ جلدی سے بیٹے تمہاری شادی کر دیں پھر موت آجائے تو کوئی غم نہیں۔

کیا کہا امّی شادی۔ میں شادی وادی نہیں کروں گا۔ میری زندگی کو کسی کا پابند نہیں بنایئے۔ مجھے یہ روگ نہیں پالنا ہے۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ ارشد بھیا بالکل انور کی طرح بولے جا رہے تھے۔ اور خالہ جان وہ ہکا بکا اس کا منہ تک رہی تھیں۔ بیٹا تم تو پروین سے...... محبت...... ان کی زبان میں لکنت آگئی۔

''کیا کہہ رہی ہیں امّی؟'' ارشد بھیا الجھے الجھے سے لگ رہے تھے۔ ذہن و دل کی لڑائی۔ نظریں کچھ آشنا بھی تھیں۔ کچھ نا آشنا بھی ——— دل کی شاید کچھ فتح ہوئی۔ محبت تو ایک بیماری ہے امی' جو انسان کو نکما بنا دیتی ہے۔ وہ روانی سے بولے گئے۔ پھر چپ ہو گئے۔ عجیب کشمکش تھی۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اس کے ذہن میں انور کی آواز گونجنے لگی۔ وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔ اس کے ذہن میں اداسی سی چھا گئی تھی۔ دماغ گھوم رہا تھا۔ ایسا ممکن تھا۔ ہاں! ایسا ممکن تھا۔ وہ چونکی ارشد بھیا کسی کو ڈانٹ رہے تھے۔ وہ تو کسی کو نہیں ڈانٹتے تھے۔ کیا کر رہے ہو۔ کاہلوں کی طرح۔ ہر وقت اونگھتے رہتے۔ جاؤ! جلدی سے پانی لاؤ اور سمیع گھبرایا گھبرایا سا باہر نکل آیا۔

☆☆

جھلستے پودے

شادی ہونے کوتو ہوگئی۔ ازدواجی زندگی میں جو یک رنگی و یکسانیت، ہم آہنگی، ایک دوسرے کو سمجھ جانے والی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ نہ ہو سکی اور اس بات کی ڈھکے چھپے لفظوں میں وہ مجھ سے شکایت کرتے ہیں اور میں دل ہی دل میں اس نامانوسیت، کبھی کبھی تنی تنی سی فضا کے لاکھ جواز ڈھونڈھتی۔ لیکن لاحاصل؟ یہ صحیح ہے وہ دلوں کی یکجائی، ذہنوں کی یکسانیت، دو خیالات کی یک رنگی اور سب سے بڑھ کر ایک دوسرے کا ہو جانے کا جذبۂ پُر خلوص۔ ان چیزوں کے درمیان میں کچھ تو ضرور ہے —— جو کبھی کبھی .... کسی کسی لمحے بڑی اجنبیت پیدا کر دیتا ہے۔

میں ایسا محاسبہ کرتی ہوں۔ کیونکہ ان کی نگاہیں مجھے الزام دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مجھے کچھ نہ کچھ الزام ضرور دیتے ہیں۔ زبان سے تو انہوں نے کبھی نہیں کہا —— سچ پوچھئے اس نامانوسیت کی ایک ہلکی سی لہر صرف ہمارے اور ان کے ذہنوں تک ہی محدود ہے۔ اس کو ہم نے زبان نہیں دی۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں۔ جس دن اسے گویائی مل جائے گی۔ اسی دن یہ شکایت بن جائے گی۔ اس لئے ہم دونوں اس لمحے سے گریز کرتے ہیں۔ جب اس خاص لمحے ہماری نگاہیں ملتی ہیں تو ہم فوراً نگاہیں چرا لیتے ہیں اور یوں وہ لمحہ ہمارا رقیب اپنی شکست خوردگی کے ساتھ دبے

پاؤں گذر جاتا ہے۔ لیکن ہم اس سے خائف ہیں۔ سچ پوچھئے تو بڑا ڈر لگتا ہے۔ کب تک ہم آنکھیں چرائیں گے۔ حقیقت حقیقت ہے۔ جس سے آنکھیں ملانی ہی پڑیں گی۔ کبھی کبھی ہم یہ سوچتے ہیں کہ جس دن یہ حقیقت مجسم اعتراف بن جائے گی اور ہم دشمن کو دشمن مان لیں گے۔ شاید کہ اس دن یہ تناؤ ——— یہ نامانوسیت کی ایک لہر جو کبھی کبھی جب کہ ہم بہت مسرور رہتے ہیں۔ اکثر شام کو چائے کی میز پر کوئی بڑی پرمحبت سی فضا رہتی ہے۔ تو اچانک چپکے دبے پاؤں سے میرے دل کی تنہائیوں میں ایک تختی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک دم سے جیسے دل کے بیچوں بیچ کوئی چھوٹا سا ننھا سا تنکا رک جائے۔

وہ بہت اچھے ہیں۔ سب سے بڑی اچھائی یہ کہ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ خوبصورت، بلند و بالا شخصیت کے مالک ہیں۔ میں نے جب شباب کی دہلیز پر قدم رکھا تو میرے دل کے بت خانہ میں جو بلند بالا شخصیت نصب تھی۔ وہ بالکل ان سے مشابہ۔ ہر لڑکی کی طرح میں نے بھی اس کی پرستش کی سوچی تھی۔ ٹوٹ کے چاہنے کا خواب دیکھا تھا۔ ایسی محبت جو مثال بن جائے۔ ابو مجھے ڈاکٹر بنانے کی سوچ رہے تھے اور ہم دل میں ایک بت سجائے بیٹھے تھے۔ پھر پتہ نہیں حالات نے یا جاوید کی آمد نے ابو کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کیا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے کہ میری بیٹی بہت ذہین ہے۔ میں اسے ڈاکٹر بناؤں گا۔ لیکن چیزوں کی بڑھتی قیمت اور نوٹوں کی گھٹتی ہوئی اصلیت نے ابو کو خاموش کر دیا۔ پھر جاوید بھی مکئی کے پودے کی طرح اچانک بڑھ گیا۔ اس نے میٹرک بھی بڑی تیز گامی سے پاس کیا۔ اب ابو خاموشی سے میری منسوب پر غور کرنے لگے۔ اکثر میرے کانوں میں بھنک پڑتی۔ لڑکا آفس میں کلرک ہے۔ اچھی تنخواہ ہے۔ تین ہزار روپئے مانگتا ہے۔ پھر کیا ہوتا، مجھے کچھ خبر نہیں۔ کبھی یہ سننے میں آتا کہ وہ کچہری میں پیشکار ہے۔ تین سے دو ہزار کماتا ہے۔ اوپر کی آمدنی کئی سو ماہانہ ہے۔ پانچ ہزار میں بات طے ہو جائے گی۔ ابو خاموش رہتے۔ ابو کیوں خاموش تھے۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔ میں نے ابو کا اکاؤنٹس دیکھا تھا۔ اس میں بیس ہزار روپے تھے۔ اب اکثر ابو کہتے کہ جاوید زیادہ ذہین تو نہیں کہ میڈیکل کمپیٹیشن کمپلیٹ کرلے۔

انہوں نے جاوید کو حساب دلوا دیا کہ انجینئرنگ میں ڈونیشن کم لگتا ہے۔

اور پھر اسی حساب کتاب میں جب ایک دن امی نے ابو کو انگلیوں پر گن کر میرے بارے میں کچھ کہا۔ تو میں نے ابو کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں دیکھی۔ پھر یہ لکریں گہری اور گہری ہوتی گئیں۔ میں ابو کی پیشانی کی طرف اب نظریں نہ اٹھا سکتی۔ پھر ماہ و سال پر لگا کر اڑتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ دن مہینے بن گئے ہیں اور مہینے سال۔ وقت کی اس جست نے تو ہمیں شکست دے دی ہے۔ ہم اس کے تعاقب میں ہانپ چکے ہیں۔ اس کا مقابلہ آسان نہ ہوگا۔ اب ابو گھبرائے گھبرائے سے رہنے لگے۔ کئی جگہوں سے بات آئی۔ لیکن بالکل اوٹ پٹانگ سی۔ ابو نے گھبرا کے پتہ نہیں کیا کیا سوچ ڈالا۔ بھئی اچھا لڑکا تلاش کیجئے۔ جو مانگے گا دیں گے۔ یہ ابو کا آخری فیصلہ تھا۔ لیکن پھر بھی خاموشی۔

پھر نہ جانے کیسے ان کا پیام آیا۔ مہینوں میں مجھے مایوں بٹھا دیا تھا۔ اکاؤنٹس بک کی ضرورت پڑی اور پھر مجھے کچھ خبر نہیں۔ پھر جب اکاؤنٹس بک کو میں نے ردّی کے ٹوکرے میں پڑا پایا تو بے اختیار اسے اٹھالیا۔ وہ بیکار ہو چکا تھا۔ اس میں ایک پائی بھی نہ چھوڑی گئی تھی۔ میں نے اسے ردّی میں ڈال دیا۔ بارات کے دو دن پہلے نئی کار کے تیز ہارن کی آواز آئی اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ میرے دل کے بت خانے میں نصب بلند بالا دیوتا کو بھینٹ چڑھائی جائے گی۔ اچانک دل کے نہاں خانوں میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ بتخانے کے جگمگاتے عکس جھلملا کر رہ گئے۔

اور......اور......وہ میرا بلند و بالا...... پر بت کیا ہوا۔ لوگوں میں ٹٹولی جاتی ہوں۔ کوئی میرا ہاتھ پکڑ لو۔ کوئی جاوید؟ تو نے میرا بازو پکڑا ہے۔ دیکھو ا یہ راستہ ہے۔ اِدھر قدم رکھو اِدھر ......وہ آگے بڑھتا— جاوید...... میرا بھائی...... تجھے اندھیرا نہیں لگتا۔ سب سے زیادہ تاریکی تو تیری راہوں میں پھیل گئی۔ بھیا میں تو تیری ہی تاریکی سے گھبرا گئی ہوں۔

پھر جاوید نے مجھے نئی چمچماتی کار میں بٹھا دیا۔ کیا کرتے ابو ان کا ارادہ یوں اپنے بچے کی راہ میں تاریکیاں پھیلانے کا کبھی نہ تھا۔ میں اور جاوید تو ان کی دو آنکھیں تھے۔ کون چاہتا ہے

کہ ایک آنکھ کی حفاظت کے لئے دوسری آنکھ کی جوت کو بجھا دیا جائے۔ وقت...... حالات کے ہم اسیر ہیں۔

دل کے نہاں خانوں میں ننھے ننھے پودے اُگتے ہیں۔ یہ پودے اپنے فرض، محبت ان کے التفات کی گرمی پا کر جھلس جاتے ہیں۔ شاید یہی وہ پودے ہیں۔ جن کے ڈوبنے سے باد سموم چلتی ہے۔ ان کی ہواؤں میں ہلکی ہلکی اجنبیت و نامانوسیت کی خوشبو ہے۔ اس لئے اس پودے کو میں سر اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی۔ ان کے پیار کی ہلکی ہلکی آنچ۔ میری معمولی معمولی خواہشوں پر ان کی پر شوق تکمیل کی سرگرمی، میری ہلکی تکلیف پر ان کی بے چینی، ان کا اتھاہ پیار میں ڈوبا ہوا والہانہ سلوک، مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ میں ان پودے کو شاداب دیکھوں۔

لیکن میں کیا کروں کہ میں اس لمحے سے عاجز ہوں۔ اے خدا میری مدد کر! وہ میرے مجازی خدا ہیں۔ ان سے محبت کرنے میں تیری مدد ضرور ساتھ ہوگی۔ وہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ خدایا یہ لمحہ مجھے شکست دینے پر تل گیا۔ یہ پودے بار بار سر اٹھاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ان پر تیری کوئی ناخوشی عیاں ہو۔ وہ مجھے کار پر سیر کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا کروں کہ جب بھی کار پر سیر کرانے کی خواش ظاہر کرتے ہیں دل میں کوئی شئے اٹک جاتی ہے اور پھر اس لمحہ سے میں خائف ہوں۔ ڈر جاتی ہوں جب اس لمحہ کو زبان بن جانے کا خدشہ ہو جاتا ہے اور ان پودوں کو پتہ نہیں کیسے ہوا دینے لگتا ہے اور میں گھبرا جاتی ہوں۔ یا تو میرا سر دکھنے لگتا ہے یا پیٹ کی کوئی شکایت ہو جاتی ہے اور میں ان سے معذرت کر لیتی ہوں۔ لیکن آخر کب تک۔

کل کی بات ہے۔ میں گھر گئی تھی۔ جاوید کے کمرے میں ٹیبل پر انجینئرنگ کا فارم رکھا تھا۔ ہاں جاوید نے اسی درمیان میں آئی. ایس. سی کر لیا ہے۔ میں نے الٹ پلٹ کر وہ فارم دیکھا ۔ پینتیس ہزار ڈونیشن مانگتا ہے۔ میں نے جاوید سے استفسار کیا تو اس نے لاپرواہی سے کہا کہ چھوڑو باجی۔ ڈونیشن دے کر کون پڑھتا ہے۔ میں نے بی. ایس. سی میں ایڈمیشن لے لیا ہے۔ اور میں خاموش ہوں۔ دل کے نہاں خانوں میں اُگ آنے والے وہ پودے، جوان کی محبت، خلوص

والہانہ پیار کی تپش پا کر جھلس چکے تھے۔ جاوید کی آنکھوں کے ٹھہرے ہوئے بادل اور ابو کے نگاہوں کے خوابوں کے اڑتے ہوئے نرم ہواؤں سے پھر سر اٹھانے لگے اور ہری ہری سبز پتیاں پھر ڈولنے لگیں۔

میں گھر چلی آئی اور خود کو سارا دن مصروف رکھا وہ شام کو آئے۔ میں نے حسب معمول اپنی مسکراہٹ کے گلدستے انہیں پیش کئے۔ ان کا ہاتھ بڑھا۔ لیکن وہ جان لیوا لمحہ درمیان میں آ گیا۔ نگاہیں ملیں۔ بادل تیرتے ہوئے بادل...... یا خدا! میں کیا کروں...... آج لمحے کو زبان نہ مل جائے۔

زبان کھل گئی پھر کچھ باقی نہ رہے گا۔ دریا پر باندھ باندھنا ضروری ہے۔ ورنہ سیلاب کتنے گھروں کا سکون و آرام لوٹ لیتے ہیں۔

بارے خدایا آنکھوں نے میری لاج رکھ لی۔ آنکھوں میں سمندر کی گہرائی تھی اور لبوں پر صرف خاموشی ——— وہ مجھ سے پوچھے جاتے تھے کہ "کیوں طبیعت خراب ہے۔ سر میں درد ہے۔"

☆☆

اَندھیرے اُجالے

وہ رنگ ونور کی دنیا میں کھوئی تھی۔ شامیانے کے نیچے جلتے رنگین بلبوں کی قوس قزح تلے وہ بہت سی مہمان بیبیوں کے درمیان بیٹھی خود کو اجنبی اجنبی سی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے آس پاس نظریں دوڑائیں کوئی بھی ایسا چہرہ نظر نہ آیا جو اس احساس تنہائی کا سدباب ہوسکتا۔ اس نے اپنے آس پاس بیٹھی خواتین کی باتوں میں دلچسپی لینا چاہی تو دل اور بھی اچاٹ ہوگیا۔ زمانہ بھر کی لڑکیوں کے طور اطوار، لڑکوں کی بڑھتی ہوئی مانگیں۔ جہیز کی لمبی فہرستیں، بہوؤں کی خوبیاں اور خوشدامنوں کی سختیاں۔

اس نے اکتا کر شامیانے میں سجائے ہوئے کاغذی پھولوں کو گننا شروع کر دیا۔ وہ اپنے اس مشغلے میں کھوئی رہتی۔ کہ معاً رنگ وخوشبو کا ایک چمکدار ہیولیٰ اس کے سامنے سے گذر گیا۔ وہ چونک پڑی وہ چہرہ...... اس نے پلٹ کے بڑی دور تک اس کا تعاقب کیا۔

بالکل وہی چہرہ...... اس کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوندنے لگی۔ دل دھڑکنے لگا۔۔۔ سرموفرق نہیں۔ ہر چیز ایک، ناک نقشہ، رنگ، زلف، پیشانی، زلف کی ایک لٹ جو پیشانی کو چومتی ہوئی کانوں تک جاتی۔

یا اللہ! کون سی ایسی چیز ہے۔ جونہ ملتی ہو۔۔۔ ایسی مماثلت، ایسی مشابہت آخیر کیسے؟۔۔۔ وہ دور تک ہونقوں کی طرح انہیں دیکھتی رہی۔ اس طرح اپنے دیکھنے پر اسے خفت سی محسوس ہونے لگی۔ کیا کہیں گی یہ آس پاس بیٹھی خواتین، لیکن وہ کیا کرتی اگر ہم حیثیت فرد ایک دوسرے سے جلتے ہوں تو ہم آپ اس بات پر حیرت کا تو اظہار کرتے۔ لیکن ایسا اچنبھا نہیں ہوگا۔ کوئی ایسی انہونی نہیں ہوتی۔ اور وہ مماثلت بھی مماثلت کی حد تک ہوتی ہے تاکہ یہ مشابہت کہ خدا تعالیٰ نے قدم اٹھانے کا انداز بھی دونوں میں ایک سا بنایا۔ زلفوں کے سنوارنے کا بھی ایک طریقہ، پیشانی پر چمکتی ہوئی وہ لٹ، وہ بھی بالکل ایک......

اسے میرے خدا! وہ بھی کون ایک ماما ایک کرپٹ و فاحشہ عورت اور ایک رئیس اور باوقار خاتون کا۔

وہ زیوروں میں سجی ہوئی، بھاری بنارسی ساڑی باندھے۔ اس بی بی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ وہ ضرور مہمان بیبیوں میں کوئی نمایاں حیثیت کی مالک تھی۔ کیونکہ صاحب خانہ کی بیگم کو ان کی خاطر میں بچھا ہوا پا رہی تھی۔

آخر یہ کیا راز ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی رشتہ ان دونوں چہروں میں ہے۔ وہ دن رات آٹھوں پہر وہ چہرہ دیکھتی رہتی تھی۔ اوپری منزل اپنے اپنے کمرے کی کھڑکی کے پٹ کو بھیڑ کے وہ گھنٹوں اس عورت کو دیکھتی جس کی ہر ادا میں بازارو پن تھا۔ جو کئی افغانوں کے درمیان ایک واحد عورت تھی۔ کنویں میں ڈول سے پانی کھینچتے ہوئے، سل پر مسالہ پیستے ہوئے۔ ہاتھوں میں مہندی رچائے، افغان سے ہنس ہنس کر گفتگو کرتے۔ آخر کس ادا میں اس نے اسے نہیں دیکھا، کیا اس چہرے اور خاتون معزز کے چہرے میں کوئی فرق تھا۔ ذرا سا بھی ایک بال برابر بھی......

بس یوں سمجھئے کہ ان میں کوئی ایک — آئینہ کے مقابل کھڑی ہوگئی ہو۔ اس کا دوسرا چہرہ آئینہ میں نظر آیا ہو، پھر جتنی دیر بھی وہ وہاں بیٹھی رہی۔ سامنے مسند وگاؤ تکیے پر بیٹھی اس بی بی کو گھورتی رہی۔ وہ بی بی اس کے اس طرح تکنے سے بے خبر ہنس ہنس کر دوسروں سے گفتگو کرتی رہی اور اس کا ذہن قلابازیاں کھاتا رہا۔

ہزاروں کہانیاں اس کے دل میں جنم لینے لگی۔ سیکڑوں انجانے رازوں پر سے اس کے تخئیل کے پردے اٹھائے ایک کرید، ایک بے چینی اسے ہونے لگی۔

اگر ان خاتون کی ہم شکل کوئی انہیں جیسی ذی حیثیت خاتون ہوتی تو اسے ہرگز یہ حیرانگی، یہ جستجو نہ ہوتی۔ ایسی تو ہزاروں مثالیں ہیں۔ لیکن یہاں تو ؎

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

کہاں یہ شان کہ ایک ایک ادا سے امارت وسطوت نمایاں اور کہاں وہ ذلت خواری۔ وہ ماما گیری وہ اوباش ذلیل ماما۔ کہاں وہ سونے کے جگمگاتے کنگن اور کہاں وہ کانچ کی سبز سبز چوڑیاں۔ کہاں یہ کمخواب کی قیمتی حسین جوتیاں۔ وہاں فٹ پاتھ پر بکنے والی پلاسٹک کی ڈیڑھ روپے والی چپل، جو اس کی ایڑیوں سے دو انگلی نکلتی ہوئی ہوتی۔ جنہیں پہن کر وہ خود کو گھر والی تصور کرتی۔ دو قدم چلتی اور اپنے پیروں کو دیکھتی اور یوں چلتی جیسے کوئی فرش پہ چلتی عرش پر نگاہ ڈالے۔

شاید پہلی بار پیروں نے ایک نیا بندھن محسوس کیا تھا۔ اس لئے قدم چپل سے نکلنے کے لئے بیتاب، قدم کہیں رکھتی اور پڑتے کہیں اور —— یہاں کانوں میں جھولتے ہوئے بجلیاں اور کہاں وہ پیتل کی سستی چار آنے والی پتیاں —— اس کا ذہن ان کے باوقار سنگھار اور اس کے سستے مذاق کا موازنہ کرتی رہیں۔

اسے ماما کے ہاتھوں اور پیروں میں لگی ہوئی مہندیوں کی سرخیاں نظر آئیں اور اس کی نگاہوں نے مہمان خانے میں، سلیقے سے لگے، نیل پالش کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ اس ذہنی مقابلے وموازنے میں پتہ نہیں کتنا وقت کٹ گیا۔ اسے کچھ احساس نہ ہوا۔ اس کی گاڑی آئی اور وہ

کھوئی کھوئی سی گھر پہنچ گئی۔

اس نے کپڑے بدلنے سے پہلے کھڑکی سے افغان کے آنگن میں جھانکا۔لیکن وہاں گھپ اندھیرا تھا۔وہ جیسے تیسے کپڑے بدل کر بستر پر جا سوئی۔رات بھر ماما سے اور مہمان بی بی سے رشتے کی لڑکیوں کا ملا جلا خواب دیکھتی رہی۔

صبح سویرے بوا نے اسے جگایا اور نماز سے پہلے اس نے کھڑکی کی اوٹ سے افغان کا آنگن جھانکا۔ماما ایک افغان سے کھڑی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی——وہ سکتہ زدہ سی پیچھے ہٹ گئی۔رات اس نے اس مہمان بی بی کو کئی بار ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ان کے دانتوں کی سفیدی اس کی نگاہوں میں کوندنے لگی۔

پھر نماز میں بھی اس کا دل نہ لگا۔باورچی خانے میں بھی وہ یکسوئی سے روٹیاں نہ بیل سکی۔کئی بار اس نے بیخیالی میں ہاتھ جلالئے۔یہ مشابہت اتفاقیہ ہرگز نہیں ہوسکتی۔کسی نے اس کے دل میں چپکے سے کہا۔پھر اگر یہ اتفاقیہ نہیں تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔دو ہم شکل کو بالکل دو متضاد ماحول میں لا پھینکا——لیکن اسے کون کہتا کہ ایک گنجلک دماغ ایسے ایسے ہزاروں متضاد ماحول پیدا کرسکتا ہے۔

وہ اماں بی کا ماحول ہی تھا جہاں نصرو چچا کا گنجلک دماغ موجود تھا۔جو ہر سیدھی بات کو ماننے سے انکار کرتا۔بعض لوگوں کی یہ ٹینڈنسی ہوتی ہے کہ خود کو ممتاز کرنے کے لئے کبھی اچھی باتوں کو بھی اپنے بیہودہ اور بکواس نظریہ حیات کے مذاق سمجھتے اور کوئی کیا کرے۔نوجوانوں کی یہ عام روش ہے۔

نصرو چچا تو تھے بھی لا اُبالی۔دس سال کمیونسٹ خیال کے حامی رہے۔پکے نیچرلسٹ تھے۔جانوروں کا فلسفۂ حیات تھا جو پسند آجائے......اس پر تمہارا حق،سماج،مذہبیت،رسم و رواج کوئی بھی منع کرنے کا مجاز نہیں اور اس پسندیدہ شئے سے گھڑی گھنٹہ دل بہلا کر پھر اسے یوں بھول جاتے کہ شاید کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔

نصرو چچا پڑھے لکھے آدمی تھے۔ کیمسٹری کے پروفیسر تھے۔ اپنے نظریئے حیات کے لئے منطق بھی رکھتے تھے اور گھر میں تھا ہی کون جو اس سے اختلاف کرتا۔

ایک اماں بی جوان کی ماں ہی تھی۔ ایک چھوٹی چچی اس کی بیوی جو ہاں کہنے کے سوا نا جانتی ہی نہیں تھیں۔ ان لوگوں کو نصرو چچا کے نظریات سے کوئی بحث نہیں تھی۔ نصرو چچا کو کیا پسند آئے، کسے اپنائیں، کسے پھینکتیں اس سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی۔ ان دونوں خاتون کو بس ایک تڑپ، ایک آرزو تھی جس کے لئے وہ دن رات منتیں مانتی تھیں۔ اس سونے آنگن میں معصوم کلکاریوں کے ساز جاگے۔ ننھے ننھے قدموں کے نقش سے گیلے آنگن میں گڑھے پڑ جائیں۔ کوئی اپنے کیچڑ بھرے پیروں سے ان لوگوں کی گود میں یوں بیٹھے کہ سارے کپڑے خراب ہو جائیں۔ لیکن نصرو چچا انہیں شاید اس سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ ایک اچھے سائنٹسٹ (Scientist) مانے جاتے۔ ان کے سائنسی مقالے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے۔ ان کے کئی مقالے سائنس کے نصابوں میں شامل تھے۔ ان کی دنیا کتاب اور کالج اپنے نظریات اور اس کی تکمیل تک محدود تھی۔ ان عورتوں کی کیا خواہشیں ہیں۔ کیا آرزوئیں ہیں۔ ان سب کو جاننے کی انہوں نے کبھی کوئی خواہش نہیں کی۔ چھوٹی چچی اکثر سوچتی رہتیں۔ یا خدا! کیا ان کے دل میں باپ بننے کی خواہش نہیں مچلتی۔ وہ بھی تو کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ اس پر دل ہی دل میں اطمینان کا سانس بھی لیتیں۔ ورنہ کوئی اور مرد ہوتا تو اور نہیں تو کچھ اپنی خواہش کا اظہار کر کے ہی ان کی زندگی کو دوبھر بنا دیتا۔

سچ تو یہ ہے کہ نصرو چچا کو باپ واپ بننے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ورنہ ان کو کوئی خواہش ہو اور وہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچے یہ ان کے مسلک میں حرام تھا۔ یہ فلسفہ حیات ہو تو نصیبن بوا کی بیٹی کا نصیب کہ وہ نصرو چچا کو پسند آگئی۔ پھر وہ کب ان کے تصرف میں آئی اور کب گلے کا ہار بننے سے پہلے اتار پھینکی گئی۔ اس کی خبر کسی کو نہ ہوئی اور کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی اگر اماں بی کی آرزوئیں آنکھیں نہ بن جاتیں۔ معصوم کلکاریوں کو اپنے آنگن میں سننے کی حسرت نے ان کو ہزار

کان اور سیکڑوں آنکھیں عطا کر دی تھیں۔ وہ تو ہر صبح اٹھتیں۔ خدایا! خوشی کی کوئی خبر سنوں اور سارا دن مجسم سماعت بنی رہتیں۔ ہر نئے سورج کے طلوع کے ساتھ جسم مجسم بینائی بن جاتا۔

اور پھر چھوٹی چچی کے حرکات وسکنات پر نظر رکھتی۔ وہ ان کے اٹھنے بیٹھنے کا خاموش مطالعہ کرتی رہتی۔ کبھی بھولے سے بھی چھوٹی چچی کو آبکائی آئی یا دہلیز پر بیٹھی تو ننگے پیروں تخت چھوڑ کر ان کے قریب آتی۔ مسرتوں سے کانپتی آواز میں یوں وجہ طلب کرتی کہ چھوٹی چچی کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

وہ سوچتیں، اے کاش! کبھی وہ اس قابل ہوتی کہ ان کی امیدیں بن جاتیں۔ لیکن وہ تو خشک وبنجر زمین تھیں۔ جس پر آرزوؤں کے لاکھ بیج ڈالے جائیں۔

لیکن.......... انہیں کیا پتہ کہ فصل کھڑی ہو چکی تھی۔ زمین یہ نہ سہی اور سہی —— ان کا ماتھا تو جب ہی ٹھنکا تھا جب انہوں نے مسلسل کئی دنوں تک نصیبن کو صبح ایک ایک سے لیموں مانگتا ہوا پایا۔ حدیثہ کو پتہ ہو گئی۔ اب کی صاحب تنخواہ دیں گے تو ڈاکٹر کو دکھلائیں گے۔ کچھ کھاتی پیتی نہیں ہے۔ سب الٹی کر دیتی ہے۔ ایک دو دن کی بات ہوتی تو وہ دھیان بھی نہ دیتیں یہ تو ہفتوں سے ہو رہا تھا۔

اور پھر حدیثہ وہ بھی تو دن بھر سر گاڑے اپنی کوٹھری میں پڑی رہتی ہے —— اب اماں بی کا شک یقین میں نہ بدلتا تو اور کیا ہوتا —— اور پھر ایک سرد رات کو جب سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو اماں بی باورچی خانے کے بغل والی کوٹھری میں جا گھسیں۔ حدیثہ پریشان پریشان سی کھٹولی پر پڑی تھی اور نصیبن بوا دوسری کھٹولی پر اپنے سونے کا انتظام کر رہی تھی کہ اماں بی کو دیکھ کر ہڑبڑا گئی۔

آپ.......... آپ کیوں آئیں بیگم صاحبہ؟ لیکن بیگم صاحبہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک ٹک حدیثہ کو گھورتی رہیں —— اور حدیثہ ان کی آنکھوں ہی سے سہم گئی۔ ڈری ڈری سی انہیں تکتی رہی۔

''کیوں؟ تیری کیا طبیعت خراب ہے۔'' وہ ایک موڑھے پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔ حدیثہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو سادگی سے نصیبن بوا بولیں۔

''بیگم صاحبہ کیا بتائیں کہ اس کی کیا حالت ہے۔ ایک دانہ نہیں پچتا ہے۔ سب الٹی ہو جاتی ہے۔ پت ہوگئی ہے۔''

''پت وِت کچھ نہیں ہے۔ بڑی ہوگی تو سٹھیا گئی ہے۔ کچھ بھی نظر نہیں آتا——''

نصیبن بوا اماں کی بات کچھ نہ سمجھی چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگیں۔ جو اماں بی کی دور رس نظروں نے دیکھا تھا۔ وہاں تک اس غریب کا ذہن ودماغ پہنچ نہیں سکتا تھا۔

لیکن حدیثہ .... حدیثہ اس کی تو حالت غیر ہوگئی۔ دم سینے میں اٹکنے لگا۔ دل دھڑکنا بھول گیا ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ ایسا لگا کہ دوسرے لمحہ وہ مر جائے گی——اے کاش کہ مر جاتی۔

بول بتاتی کیوں نہیں۔ اماں بی نے سرد لہجے میں پوچھا——وہ اماں بی کا جلال دیکھ چکی تھی۔ جب انہیں غصہ آتا تو کوئی انہیں سرد نہیں کر پاتا۔ بتاتی ہے یا میں باہر دہکتے چولہے سے کوئلہ اٹھا کر تیری زبان پر رکھ دوں تا کہ ہمیشہ کے لئے بولنے سے محروم ہو جائے اور تب سسکتے ہوئے اس نے وہ سب کچھ اماں بی سے کہہ دیا جس کو سننے کے لئے وہ پہلے ہی تیار بیٹھی تھیں۔ ہاں! البتہ نصیبن بوا۔ وہ زمین میں دھنستی چلی گئی۔ نیچے اور .... نیچے پاتال میں اترتی گئیں آنکھوں تلے تاریکی چھانے سے سر چکرایا اور دھڑام سے زمین پر گر گئیں۔

بڑی دیر بعد انہیں ہوش آیا۔ تو اماں بی جانے کو کھڑی تھیں۔ انہوں نے اپنی کمر سے نوٹوں کی ایک چھوٹی سی گڈی نکال کر نصیبن بوا کے حوالے کیا اور چابی لیتی کمرے سے نکل گئیں۔

دوسری صبح نصیبن بوا کا کمرہ خالی تھا اور کسی نے انہیں تلاش بھی نہیں کیا۔ نصیبن بوا کو تو نہیں۔ ہاں! چھوٹی چچی کی نگاہوں نے ان کے یوں اچانک جانے کی وجہ ضرور تلاش کر لی۔

اس رات وہ بڑی دیر تک جانماز پر گڑگڑاتی رہیں۔

''اے خالق کون و مکاں! یہ تیرا کیسا انصاف ہے کہ جو تجھ سے مانگے وہ تو تہی دامن رہے اور جو دامن بچا کر نکلنا چاہے۔ اس کی تو گود بھر دے۔ اسی لئے کہ تیری عطا جو کسی کے لئے رحمت بنے وہ دوسروں کے لئے زحمت بن جائے — یا اللہ یہ تیری کیسی تقسیم ہے مالک۔ یہ کیسا بانٹ میرے مولا — وہ روتی رہیں، عاجزی کرتی رہیں —— اور شاید خالق کون و مکان کو ان کی عاجزی پر ترس آ گیا۔

اور جب دس مہینے بعد نرس نے نہلا کر ایک خوبصورت سی بچی اماں بی کی گود میں دیا تو انہیں کیا خبر کہ ان کے گھر سے ہزاروں میل دور ایک غریبوں کی بستی میں ان کی ایک پوتی جنم لے چکی ہے اور جسے نصیبن بوا گود میں لے کے بیٹھی ہیں۔ کیونکہ اس پوتی کو دادی کی گود نصیب نہیں تھی۔

لیکن یہ تو ایک راز ہے اور اب ایسا دنیا میں کوئی نہیں جو اس راز پر سے پردہ اٹھائے اور وہ اب تک یونہی کھڑکی کے پٹ کھولے اس ماما کو تکتی ہوئی سوچتی ہے — اتنی مماثلت والی مشابہت بہت اتفاقیہ تو نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں؟

داھا

اماں، اس واقعے کو یوں بیان کرتی ہیں۔ جیسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ ممانی جان کا گھر ماشاء اللہ پوتے پوتیوں سے بھرا پڑا تھا۔ پھر بھی ممانی جان کو کیا سوجھی کہ ایک سانپ کے پوت کو پال لیا۔

پہلے پہل تو بھائی جان کو بھی بڑی الجھن ہوتی تھی۔ جب ساس کو دیکھتی کہ اور کسی کے کھانے پینے کی تو انہیں چنداں فکر نہ ہوتی۔ لیکن اس سانپ کے بچے کے لئے جسے سب لوگ ''داھا'' کہتے خود باورچی خانے میں تشریف لے جاتیں، کانسے کے چمچاتے پیالے میں جو'داھا' کے لئے ہی مخصوص تھا۔ بلائیوں سمیت دودھ ڈھالتی، بڑے چمچے سے دو چمچے بھات ڈالتیں اور آنگن کی نالی کی طرف چل دیتیں اور ''داھا'' جو ہمیشہ نالی میں گھسا رہتا۔ ان کے قدموں کی چاپ سے باہر نکل آتا — اور جب وہ پیالہ اس کے آگے رکھتیں تو وہ پہلے اپنا سر اٹھا کر ممانی جان

کی انگلیوں پر رکھ دیتا۔ ایسا لگتا کہ وہ شکر کے جذبے کے ساتھ ایسا کرتا ہو۔ کبھی بڑھ کر کلائیوں تک پہنچ جاتا۔ ممانی جان آہستہ سے اسے اٹھا کر نیچے رکھ دیتی اور پھر 'داھا' پیالے کی طرف جھک جاتا۔ ممانی جان نل کی طرف جاتیں۔ کلائیوں تک ہاتھ دھوتیں اور پھر مصلّٰی پر جا بیٹھتیں۔ ''داھا'' کو کھانا دینے کے سوا وہ گھر کا اور کوئی کام نہ کرتیں۔ کبھی بھابی جان کسی کام میں رہتیں اور غسل خانہ کی طرف چلی جاتیں اور بچے کھانے کے لئے ضدیں کرتے تو بھی ممانی جان توجہ نہ فرماتیں۔ لیکن خدا جانے ''داھا'' سے انہیں ایسی کیا محبت تھی۔ بھابی جان اکثر سوچتیں۔

جب 'داھا' پیالی خالی کر کے نالی کی طرف رینگ جاتا۔ تو بڑی بی بائیں ہاتھ سے کانسے کے پیالے کو اٹھا کر نل کے نیچے ڈال آتیں۔ جب اس پر ڈھیروں پانی گر جاتا۔ تو ایک خشک پتہ لے کر پیالے کو مانجھ ڈالتیں اور پتے کو نالی میں پھینک آتیں۔ تاکہ غلطی سے گھر کے برتن نہ اس سے دھل جائیں۔ اب وہ اس کام کی عادی ہو گئیں تھیں ورنہ پہلے تو انہیں خاصی جھنجھلاہٹ ہوتی اور اس لئے اکثر خفا ہو جائیں اب تو ایسا محسوس ہوتا کہ انہیں بھی ''داھا'' سے کچھ انسیت سی ہو گئی تھی۔ کوئی گرم چیز نالی میں نہ بہاتیں۔ 'موا' کہیں مر نہ جائے۔ بھات پک جاتا تو ممانی جان کو پکارتیں۔ بھات پکنے میں دیر ہو جاتی تو منہ ہی منہ بڑبڑاتیں۔ صبح سے بھوکا پڑا ہے 'موا' بے زبان ہے۔ کچھ بول بھی تو نہ سکے۔

گھر کے بچے بھی اب 'داھا' سے مانوس ہو چکے تھے۔ اکثر جب 'داھا' کانسے کے پیالے میں منہ ڈالے دودھ پیتا رہتا بچے اسے گھیر لیتے۔ کبھی دوپہر کے وقت بچے آنگن میں کھیلتے رہتے ''داھا'' بھی گرمی سے گھبرا کر باہر نکل آتا۔ بچوں کے قریب سے گذرتا ہوا۔ قریب والی نالی میں جا گھستا۔

کہتے ہیں کہ یہ 'داھا' اس وقت سے ممانی جان کے پاس تھا۔ جب کہ مجید میاں نے گھٹنوں پر چلنا بھی نہ سیکھا تھا۔ پنگوڑے میں پڑے کلکاریاں مارتے رہتے اور 'داھا' کنڈلی مارے ان کے کھٹولے کے پاس پڑا رہتا۔

تب گھر بڑا سونا سونا سا لگتا تھا۔۔۔ ماموں جان اکثر دورے پر رہتے۔ ممانی جان اتنے بڑے گھر میں تنہا بولاتی بولاتی پھرتیں۔ ملازموں کا کیا ہے آج آئے کل رخصت۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ ملازمہ بھاگ گئی تھی۔ رشید کو دن چڑھے سوتے رہنے کی عادت تھی اور ماموں جان کے نہ رہنے کی وجہ کر اور کھلی چھٹی تھی۔ ممانی جان صبح پو پھٹتے ہی اٹھ بیٹھتیں۔ یہ ان کا معمول تھا۔ اس دن بھی وہ منہ اندھیرے اٹھ کر لکڑی لانے کے لئے مکان کے پچھواڑے کی طرف گئیں۔ رشید نے خشک لکڑیاں اسی طرف رکھ دی تھیں۔ وہ لکڑیاں لینے جھکیں تو کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی سی چیز پیروں سے لپٹ گئی۔ وہ چیخ پڑیں۔ بے ساختہ انہوں نے پیروں کو جھٹک دیا۔ ملگجے سے اندھیرے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا سانپ کا بچہ دور پڑا ہے۔ بالکل مردہ سا۔ وہ لکڑیاں لے کر سیدھی باورچی خانے میں چلی آئیں۔ دن چڑھے تک وہ سانپ کا پوا ویسے ہی پڑا رہا۔

جانے وہ کون سا جذبہ تھا۔ جو دوبارہ ممانی جان کو پچھواڑے میں لے آیا۔ یتیم و یسیر سا لگا وہ بچہ انہوں نے رشید کو اسے مارنے کو بھی نہ کہا اور جب شام ہونے لگی تو انہوں نے ایک پتلی سی لکڑی اس کی کمر کے نیچے دے کر اسے اٹھالیا۔ وہ لکڑی پر مردہ چھپکلی کی طرح لٹکتا رہا۔ نہ تڑپا نہ اچھلا۔ لیکن ممانی جان کو اس کا یقین تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اسے لا کر انہوں نے دہلیز کے کنارے ڈال دیا اور سیدھے موری خانے میں چلی گئیں۔ واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک کانسے کا پیالہ تھا۔ جسے مجید میاں نے کھیلتے کھیلتے کبھی نالی میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے اسے اسٹور میں رکھوا دیا تھا کہ کبھی کوئی برتن والا آیا تو بدل ڈالیں گے۔ اسی کٹورے کو انہوں نے رشید سے منجھوا کر اس میں دودھ ڈالا اور سانپ کے قریب رکھ آئیں۔ دودھ پی کر سانپ کے جسم میں کچھ حرکت آئی اور وہ سرک کر نالی میں چلا گیا اور پھر وہی اس کا مسکن بن گیا۔ نالی سے باہر نکل کر دودھ پی لیتا اور پھر نالی میں جا گھستا۔ گھر میں کون تھا جو ممانی جان کے اس نئے شوق پر اعتراض کرتا۔ دورے سے ماموں جان واپس آئے تو انہوں نے دو تین بار بیوی کو منع بھی کیا۔ لیکن جب ان کی دلچسپی اس

میں کچھ زیادہ دیکھی تو خاموش ہو گئے۔ وہ ویسے بھی ممانی جان کے معاملوں میں دخل دینا پسند نہ کرتے تھے۔

پھر وہ سانپ پلتا رہا۔ لیکن ممانی جان مجید میاں کے سلسلے میں ہوشیار رہتیں۔ اکیلے میں انہیں چھوڑ کر نہ جاتیں۔ کیا ٹھکانہ حیوانی جبلّت ہے کہیں کاٹ کھائے۔ اس لئے جب بھی غسل خانے وغیرہ جاتیں تو بوا کو تاکید کرتی جاتیں کہ ''بوا مجید کا پنگوڑا خالی نہ چھوڑیئے گا'' — لیکن وہ بوا ہی کیا جو ممانی جان کی غیر موجودگی سے فائدہ ہی نہ اٹھائیں۔ ادھر ممانی جان غسل خانہ گئیں ادھر بوا دو کش چلم کا لینے عبدل کے کوارٹر کی طرف لپکیں۔ ایک دن ممانی جان غسل خانے سے باہر نکلیں تو دھک سے رہ گئیں۔ مجید میاں پنگوڑے میں سوئے ہیں اور ''داھا'' پھن کاڑھے ان کے چہرے پر سایہ کئے ہے۔ وہ ڈرتی سہمتی نزدیک آئیں۔ خدا خیر کرے۔ سانپ اپنی جگہ پھن کاڑھے بیٹھا رہا۔ جب کوئی مکھی قریب آتی تو تھوڑا سا ہلتا اور مکھی اڑ جاتی۔

ممانی جان کا دل شکر کے جذبے سے لبریز ہو گیا۔ پھر بھی انہوں نے پائنتی کی طرف جا کر کھٹولا آہستہ سے اپنی طرف گھسیٹ لیا اور مچھر دانی مجید میاں پر ڈال دی۔ ''داھا'' رینگتا ہوا نالی کے اندر چلا گیا۔ پھر تو جب بھی ''داھا'' مجید میاں کو اکیلا دیکھتا۔ آموجود ہوتا اور اب تو ممانی جان عادی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے 'داھا' کے ذمہ یہ کام تصور کر لیا تھا۔ اکثر انہیں کپڑے وغیرہ دھونے ہوتے اور بڑی بی کو گھر جانے کی جلدی ہوتی تو کہتی ''بیگم مجھے جلدی رخصت کر دیں۔ آپ کو تو کپڑے دھونے ہیں۔ نہانے ہیں دیر ہو گی۔'' تو وہ بڑی بی کو کھانا دے چھٹی ہی کر لیتیں۔ مجید میاں اکیلے سوئے رہتے۔ وہ نالی کے قریب جاتیں۔ ہونٹوں کی ایک ہلکی سی آواز سے ''داھا'' نکل آتا۔ پھر انہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ 'داھا' کی نظریں مجید میاں کو ڈھونڈ لیتیں۔ وہ سیدھا مجید میاں کے کھٹولے کے پاس پہنچ جاتا۔

اب تو مجید میاں ماشاءاللہ چار بچوں کے باپ ہیں اور اب ''داھا'' یہ کام ان کے بچوں کے لئے سرانجام دیتا ہے، لیکن مجید میاں سے شاید اسے ایک انس خاص ہے۔ اکثر نالی کے قریب

رہتا۔ مجید میاں کے قدموں کی چاپ سن کر باہر نکل آتا۔ سر اٹھا کر پھن کاڑھے انہیں دیکھتا۔ مجید میاں حیرانی سے اسے دیکھتے۔ بچوں کے وہ قریب بھی نہ جاتا۔ لیکن مجید میاں کے تلوؤں سے اکثر سٹ جاتا۔ اس کے جسم کے لچیلے پن سے مجید میاں کے سارے جسم میں جھرجھری سی آجاتی۔ لیکن وہ اپنے پیروں کو جھٹک نہیں سکتے۔

اور ممانی جان، انہوں نے تو خیر اسے پوسا ہی تھا اور اس کے کھانے وغیرہ کا اتنا خیال رکھتیں کہ اتنا خیال بھابی جان اپنے بچوں کا نہ رکھ پاتیں۔ اکثر گوالن ناغہ کر دیتیں تو دودھ کے لئے ممانی جان رشید کو واپر یٹو'' دوڑا دیتیں۔ اگر گوالن دودھ کم دیتی تو بچوں کا حصہ کٹتا۔ 'داھا' کے حصے میں کمی نہ آتی۔ پرانے ملازم تو خیر یوں بھی اس کا خیال رکھتے۔ کچھ وہ اس کے عادی سے ہو گئے تھے۔ کچھ مالکن کا خوف دامن گیر تھا۔

لیکن جمیلہ تو نئی نئی بھابی جان کے میکے سے وارد ہوئی تھی۔ اسے کیا فکر۔ کچھ ابھی اس نے حالات کو سمجھا بھی نہیں تھا اور اتفاقاً اس کے آتے ہی بوا بیمار پڑ گئیں۔ باورچی خانہ بھی اسے ہی سنبھالنا پڑا۔ تھی بھی وہ بڑی پھر سب ہی اس سے خوش تھے۔ یوں بھی نئے ملازم شروع میں بڑی پھرتی دکھاتے ہیں۔

جمیلہ منہ اندھیرے اٹھتی۔ لپک جھپک جھاڑو لگاتی۔ جھٹ آٹا گوندھ لیتی۔ جب تک بھابی جان بستر ہی پر رہتیں۔ ممان جان مصلی پر ہوتیں۔ آج بھی اس نے حسب معمول سارے کام نبٹا لئے اور آخر میں اس نے پانی میں چاول ڈال کر نل کے نیچے برتن لے کر بیٹھ گئی اور جب تک چاول پھوٹا وہ برتن مانجھ چکی تھی اور جھٹ پٹ چاول کا پانی پسایا اور نالی میں بہا دیا۔

بچوں کے ناشتہ کرتے کرتے دس بج چکے تھے۔ مجید میاں نے آفس جانے کے لئے سائیکل اٹھائی۔ باہر گلی میں تو...... لیکن پھر الٹے قدموں واپس لوٹ گئے۔

''اماں! انہوں نے پریشانی سے پکارا اور کہا'' داھا'' تو نالی میں مرا پڑا ہے۔''

ممانی جان مصلیٰ پر دھک سے رہ گئیں۔ ننگے پیروں دروازے تک آئیں۔'' داھا''

نالی کے سرے پر پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

کہنے کو موذی ہے۔ ایذا رساں ہے۔ انسان کا دشمن ہے۔ لیکن اس گھر میں بچوں کی طرح پلا بڑھا دوستوں کی طرح رہا۔ لیکن آج اس دنیا سے گذر گیا —— وہ بڑی دیر تک روتی رہیں۔

مذاق طرب آگیں کا شکار

جب کوئی لڑکی باورچی خانے میں گوشت بھونتے بھونتے۔ فیض، مجاز، غالب و مومن کی شاعری پر اظہار خیال کرنے لگے تو سمجھ لیجئے کہ کہیں نہ کہیں سے اس نے اپنی شامت کو آواز دے لی ہے۔ کیونکہ اسے شاید اس کی خبر نہیں۔ فیض، مجاز و مومن کی شاعری ڈرائنگ روم میں کوچ پر بیٹھ کر یا لائبریری کے خواب آلود پُرسکون ماحول میں سزاوار ہوتی ہے۔ نہ کہ گریل کی سوندھی خوشبوؤں اور چاول کے بھاپوں کے درمیان جو اشتہا کو تو بھلے تیز کر سکتی ہے۔ روح کو بالیدگی نہیں بخشتی اور جہاں اشتہا تیز ہو وہاں غالب و مومن کو لوگ زندگی میں دوسرا درجہ دیتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ شاعری روح کی غذا تو بھلے بن سکتی ہے لیکن اشرف بھیا اور ان کے دوستوں کے ٹبل پر ڈشوں میں سجائی تو نہیں جا سکتی — لیکن عطیہ باجی کو کون سمجھائے۔

عطیہ باجی! مجھے تو کبھی کبھی ان پر ہنسی آتی ہے۔ نہ جسم ان کا ہے نہ جان ان کی ہے۔

شاعری کی لطافت، افسانے کی پیکریت، مزاح کا بانکپن اور غزلوں کا تغزل — یہ سارے عناصر تھے جن سے ان کا سراپا تیار ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ سارا جسم دل ہی دل بن کر رہ گیا۔ ایسے میں ان کی شادی بھی کسی ایسے انسان سے ہونی چاہیئے جس کی خمیر بھی ان ہی اشیاء سے اٹھائی گئی ہو، تو بات بھی بنتی۔ یہاں تو افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی شادی ماموں جان کے بھانجے اشرف بھیا سے ہوگئی اور ظاہر ہے اشرف بھیا سے نہ ہوتی تو اور کس سے۔ وہ ماموں جان کے بھانجے تھے۔ عزیز بہن کی نشانی۔

دل والے تو ہر ایک کے دل کی دھڑکنیں گنتے ہیں نا، پھر عطیہ باجی کو یہ کیسے گوارا ہوتا کہ ماموں جان کا دل ٹوٹے اور ان کا دل سلامت رہے۔ وہ تو سوچتی۔

"خدایا! میرے ایسے ہزاروں دل اور دے وہ سب میرے ابو کی خوشی کی خاطر ٹوٹتے رہتے تو مجھے ملال نہ ہوتا" — تو پھر آپ ہی بتایئے ایسے میں عطیہ باجی پر ہنسی نہ آئے تو کیا رونا آئے۔

رونا تو مجھے اشرف بھیا پر آتا ہے۔ کس خطا پر کاتب تقدیر نے عطیہ باجی کو ان کے حصہ میں لکھ دی۔ ورنہ کسی اچھی بھلی لڑکی سے شادی ہوتی۔ جو ان کی خوبیوں کی معترف ہوتی۔ ان کی شان و شوکت، اثر و رسوخ، وسعت احباب پر ناز کرتی۔

خادم و خدام کے جھنڈ میں اپنے شوہر کے قدموں پر اپنی نگاہیں بچھاتی — نہ کہ یہ ہوائی پیکر! یہ غیر مادی مجسمہ کہ ہوا میں اندھوں کی طرح ٹٹولتے رہیئے اور کچھ بھی نہ پایئے۔ عطیہ باجی میں کیا تھا۔ ہر وقت آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں کا چلمن ڈالے۔ زبان حال سے میر کا کوئی پر درد مصرع بنی اپنے کمرے کے بند کواڑوں کے سایے میں خود اپنے وجود سے ہراساں — اشرف بھیا کے لئے ایک معمہ تھی۔ سمجھنے نہ سمجھانے کا۔

وہ تو یہ بھی نہ جانتے کہ کس بات سے خوش ہوں گی اور کون سی بات طبع نازک پر ناگوار گذرے گی۔ یہ بات نہیں تھی کہ انہوں نے انہیں خوش نہیں رکھنا چاہا۔

شادی کے بعد تو انہوں نے کئی شاعروں کی شاگردی اختیار کی۔ کئی کئی بار دیوان غالب اور مسدس حالی پڑھے، بحثیں کیں، مباحثہ میں شرکت کی۔ کئی کئی ہزار لٹا کر مشاعرے منعقد کروائے۔

کوئی بات تو ان پژمردہ ہونٹوں کی تازگی بن جائے ـــــ لیکن وہاں تو بس ایک خاموشی ہے سب کے جواب میں اور پھر وہ ایسے ہی خوش ہوتی ہیں تو کوئی کہاں تک انہیں خوش رکھ سکتا ہے۔

عطیہ باجی کا قصور ہی ہے کہ انہوں نے میرؔ و غالبؔ، مومنؔ و آتشؔ کو باورچی خانے میں کیوں پڑھا۔ جذبات و احساسات، لطافت و نزاکت یہ سب آپ کو باورچی خانے میں نہیں ملتے۔ ان کے پس پردہ فضائیں اور ماحول پیدا کئے جاتے ہیں ـــــ دوسرا قصور ماموں جان کا یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی لائبریری کی کنجی اپنی لاڈلی بیٹی کے حوالے کیوں کی کہ بیٹی تم سارا دن ان زندہ اور مردہ دانشوروں کے روحانی ذہنی مکتب سے اپنے دل و دماغ کو جلا بخشتی رہو۔

اس میں عطیہ باجی کا کیا قصور۔ اپنی شخصیت کی تعمیر میں خود اپنا ہاتھ کہاں ہوتا ہے۔ بزرگوں نے ہماری شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں صرف اپنی آرزوؤں کو مدنظر رکھا ہے۔

عطیہ باجی بھی ماموں جان کی آرزوؤں کی شکار تھیں۔ یہ ان کی آرزو ہی تھی نا کہ جس نے اشرف بھیا کے ہاتھوں میں سیف کی کنجی تھما دی۔ وہ کنجیاں ماموں جان کے پاس تھیں۔ دونوں کے درمیان انہوں نے رکھ دیں۔

اب ایسے میں ایک سراپا جسم بن گیا اور دوسرا سراپا دل۔ ـــــ تو قصور کس کا ہے۔ بزرگوں کا نہیں تو اور کس کا۔ بزرگوں نے ہماری آپ کی تربیت و تشکیل میں ہماری کم اور اپنی خواہشوں کا زیادہ احترام کیا۔

اور جب ہم ان کے خیالوں کے سانچے میں ڈھل گئے تو دنیا بھگتنے کے لئے چھوڑ دیا۔ ان کا اپنا بنایا انسان اور دنیا کسی اور کی۔

اشرف بھیا نے اس ایک کنجی کی ہزاروں کنجیاں بنائیں۔ بینک کے چک بھناتے رہے اور جمع کرتے رہے اور حتیٰ کہ وہ آئرن فیکٹری کے مالک بن گئے۔

عطیہ باجی لائبریری کی پرسکون خواب آور ماحول میں غالبؔ و مومنؔ سے سرگوشیاں کرتی رہیں۔

پھر جب ماموں جان کے معیار پر پوری اتر گئیں تو ماموں جان نے اس حسین مجلد اور خوبصورت کتاب کو آئرن فیکٹری کے مالک کو بطور تحفہ دے دیا۔

اب کوئی پوچھے ان سے کہ فیکٹری والے آخر اس کتاب کا کیا کرتے۔ وہ نہ اسے فیکٹری میں ڈھالنے والی مشین سمجھ سکتے ہیں نہ اسے خوشنما الماریوں میں رکھوا سکتے تھے۔ تو انہوں نے اس خوبصورت کتاب کی جلد توڑ دیں اور اس کے رنگیں سرورق کو طاق پر ڈال دیا ——— اور اب وہ کتاب اس قابل ہوگئی کہ اسے کسی جگہ پر رکھ دی جائے۔ برآمدے کے تخت پر، پلنگ کے کونے پر، لوہے کے پیڑھے پر۔ کسی جگہ بھی اس میں کوئی امتیازی شان باقی نہیں رہی۔

عطیہ باجی ایک خوبصورت کتاب نہ رہ کر ہمارے اور آپ کے جیسی ایک انسان بن گئی۔

اشرف بھیا اثر و رسوخ والے آدمی ٹھہرے۔ ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ موٹروں پر موٹریں بنگلے پر رہتیں۔ ایسے میں دن بھر عطیہ باجی کا باورچی خانے میں نہ بیتتا تو اور کہاں بیتتا۔ دعوتوں پر دعوتیں ہوتیں۔ باہر سے دس دس مرغ ذبح ہو ہو کر یوں آتے کی گردنوں سے خون ٹپکتے رہتے۔ نوکر خبر لاتے کہ باہر کمشنر صاحب آئے ہیں۔ ان کے ساتھ دن کا کھانا یہیں کھائیں گے۔

انڈے ابالے جاتے۔ چاولوں پر دم دیئے جاتے اور عطیہ باجی کو حکم چلاتے اور ہدایتیں دیتے۔ شام ہو جاتی اور ایسے میں اکثر ایسا بھی ہوتا کہ شام کو بھی اشرف بھیا کے احباب آجاتے۔

بھئی احباب کا آنا تو خوش نصیبی کی بات ہے۔ خدا نے اشرف بھیا کو اس لائق بنایا ہے۔ جب ہی تو رئیس لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

اور عطیہ باجی کو شکایت کیسی! انہوں نے ماموں جان کے یہاں گوشت بھونتے ہوئے یہ کیوں خواب دیکھا کہ شوہر کے گھر میں لائبریری کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

اور اشرف بھیا کے یہاں محض لائبریری ہی ہوتی تو کیا یہ بہت خوش ہونے کی بات ہے۔ مردوں کے ساتھ رہ کے شاید جذبات بھی خنک آلود ہو جاتے ہیں۔

یہ بات کبھی کہی تو اشرف بھیا نے نہیں تھی۔ لیکن نقش بر زباں ہم لوگوں کے ہوگئی۔ عطیہ باجی نے ان سے محبت نہیں کی۔ یہ تو میں کبھی نہیں کہتی۔ ایک مشرقی لڑکی تو شوہر کے اَن دیکھے وجود سے محبت کرتی ہے۔ ان سے محبت تو ضرور کرتی ہوں گی۔ لیکن وہ والہانہ محبت جو کسی رشتے، کسی بندھن، کسی مجبوری، کسی فرض کے طابع نہیں ہوگی۔ بلکہ جس کی کونپل دل کی نرم و گیلی زمین میں خود بخود پھوٹتی ہے اور اس کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں اندر تک پہنچتی ہیں —— ویسی کونپل کبھی بھی عطیہ باجی کے دل میں اشرف بھیا کے لئے نہیں پھوٹی۔ بس عطیہ باجی نے عام سی محبت کی وہی محبت جیسی ہماری تمہاری اُمیوں نے اپنے شوہروں سے کی ہوں گی۔ لیکن نہیں عطیہ باجی نے تو شعر و ادب کی پرورش کی ان کے ذہن نے ایک خیالی پیکر تراشا تھا اور ہماری امیوں کے ذہن پاک و صاف تھے۔ عطیہ باجی اشرف بھیا سے وفا نہ کرسکیں جس کی فضا ہم مذاق و ہم آہنگ ذہن خود بخود پیدا کرتی ہے۔

عطیہ باجی اور عام عورتوں میں خواہ کیسی ہی غیر مناسبت ہو یہ بات بالکل عام عورتوں کی سی ہے۔ انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔

اور اب ...... اب تو بے بی رحیلہ بھی باورچی خانے میں ان کی بڑی مدد کرتی ہے۔ وہ ماں کو باورچی خانے میں نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ پھر جس گھر میں روز نت نئے ملنے جلنے والے آتے رہیں۔ وہاں کوئی بیکار بیٹھے کیوں کر۔

عطیہ باجی نے تو خود کو بھلا ہی دیا تھا۔ اب تو وہ اگر باورچی خانے کا کام نہ بھی کرتی ہوتیں تو وہ تخت پر پاندان کھولے سپاری کترتے یا کسی خاتون سے گپیں مارتی رہتیں۔ بے بی رحیلہ کو انہوں نے باورچی خانے کے کاموں میں ماہر بنا دیا تھا۔ اسے ذرا بھی فرصت باورچی خانے سے نہ ہوتی۔ کبھی کبھی نانیہال جاتی۔ ورنہ وہی گھر و آنگن۔

ایک دن جب وہ نانیہال سے واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ننھی سی چابی دیکھ کر عطیہ باجی چونک پڑیں۔

یہ چابی کیسی ہے بے بی؟

رحیلہ خوش ہوگئی — ماموں جان نے دی ہے امّی کہ لائبریری سے جو کتاب چاہو نکال کر پڑھو۔ امی ان کی بہت بڑی لائبریری ہے۔ ایک سے ایک نادر کتابیں ہیں...... کیوں امّی ؟

وہ پتہ نہیں اور کیا کیا کہتی کہ ماں کو چپ چاپ اپنی طرف گھورتے ہوئے پا کر سہم گئی۔

''لاؤ۔ چابی مجھے دو''۔

عطیہ باجی نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

آئندہ تم کوئی کتاب نہیں پڑھوگی۔ مجھے لڑکیاں کتابیں پڑھتی بالکل اچھی نہیں لگتیں۔

رحیلہ کے چلے جانے کے بعد بھی بڑی دیر تک منہ ہی منہ میں کہتی رہیں۔

ایسی لڑکیاں نہ خود خوش رہتی ہیں۔ نہ شوہروں کو خوش رکھ سکتی ہیں۔

☆☆

بول انمول

بڑے بڑے ستونوں کے پیچھے لق ودق برآمدے میں لگی لگی چارپائیاں بچھی تھیں۔ بڑے ہال کے سامنے وکٹوریہ چیئر پر دادا ابا۔ آج بھی بیٹھے نظر آئے۔ دائیں طرف کے ہتھے پر حقے کی نے تھی جس کا ایک سرا دادا ابا تھامے رہتے۔ قریب ہی نسبتاً نیچی میز پر بڑا سا حقہ رکھا تھا۔ وکٹوریہ چیئر کے بائیں طرف ایک اور چھوٹی میز پر دادا ابا کا چشمے کا ڈبہ رکھا تھا۔

پاس کی چارپائی پر دادی اماں بیٹھی تھیں۔ وہ سارا دن یونہی دادا ابا کے پاس چارپائی پر بیٹھی بیٹھی خادماؤں، نوکروں کو احکامات دیتی رہتیں۔ دادا ابا کو بھی ہم نے ہمیشہ ہر گھڑی اسی چیئر پر نیم دراز پایا۔ صبح آٹھ بجے سے رات دس بجے تک دادا چیئر پر بیٹھے رہتے۔ سامنے بڑے ہال میں بڑی بڑی الماریوں کے درمیان دادا کی بڑی سی موٹے موٹے پایوں کی مہوگنی پلنگ بچھی رہتی۔ جس پر سفید بے داغ چادر عطیہ پھوپھی کے ہاتھوں کی کڑھی ہوئی خوشنما کشیدہ کاری کی ہوئی بچھی ہوئی ملتی۔ بڑے بڑے دو سفید تکیے لگے رہتے۔ لیکن میں نے کبھی دادا ابا کو اس بستر پر لیٹا

نہیں دیکھا۔ وہ یونہی سارا دن وکٹوریہ چیئر پر بیٹھے رہتے اور سارا نظام ان کے حکم کے تحت چلتا۔ گھر کے آنگن سے لے کر کچہری تک دادا ابا کے ماتحت کام ہوتے۔ امی کہتی ہیں کہ جب دادا ابا سروس میں تھے تو باہر ایک ہجوم رہتا۔ حتیٰ کہ دادا ابا رات میں بھی گھر نہ آتے۔ باہر ہی کے کمرے میں آرام فرماتے اور اب تو میں نے انہیں کبھی باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ باہر اگر گاؤں سے کوئی ملنے آتا۔ جائداد کے سلسلے میں کچھ سرکاری یا غیر سرکاری کام ہوتے تو باہر ہی جانا ہوتا تو ایک لمحہ کے لئے یوں محسوس ہوتا کہ سارے گھر کا نظام رک گیا۔ ہر آدمی اپنی اپنی جگہ پر ہی دادا ابا کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ عطیہ پھوپھی نوکروں سے راشن تلوانا چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو جاتی۔ دادی اماں ملازم چھوکری نازیہ کو ڈانٹنا بھول جاتیں۔ اکبر چچا اور اصغر چچا اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے۔ یوں منتظر رہتے کہ شاید دادا ابا انہیں آواز دیں اور دوڑیں۔ ملازم تو پاس کھڑے ہی رہتے۔ دادا ابا کسی کو دیکھتے اور دیکھتے بھی نہیں۔ بھاری تھا تن و توش ان کا۔ چشمہ کا ڈبہ ہاتھ میں لئے آہستہ آہستہ کرسی سے اٹھتے۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے برآمدے سے گزرتے ہوئے باہر چلے جاتے۔ سبھوں کی نگاہیں آہستہ آہستہ ان کا تعاقب کرتیں۔ ان کے ساتھ دروازے تک جا کر لوٹ آتیں۔ پھر سب اپنے اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ عطیہ پھوپھی راشن تلوانے لگتیں۔ دادی اماں بھول جاتیں کہ وہ کسی بات پر نازیہ کو ڈانٹ رہی تھیں۔ اکبر چچا اور اصغر چچا اپنی باتوں میں مشغول ہو جاتے۔ پھر جب دادا ابا کا بلند و بالا وجود دروازے پر نظر آتا۔ اچانک پھر نظام کائنات درہم برہم ہو جاتا اور وکٹوریہ چیئر آباد ہو جاتا۔ بیچ بیچ میں دادا ابا بھی گفتگو میں حصہ لیتے۔ دادا ابا مجھے بہت چاہتے تھے۔ پیار سے حسو کہتے۔ ایک بار مجھے یاد ہے کسی کام سے دادی اماں نے مجھے شام کو بلایا۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ لیکن دن بھر ڈینگ پانی اور بڑھیا کبڈی کھیلتے کھیلتے اتنا تھک گئی کہ شام ہوتے ہی صحن میں بچھے تخت پر ہی لڑھک گئی۔ پتہ نہیں کس وقت امی نے مجھے بستر پر سلایا۔ دوسرے دن حسب معمول دادا ابا سے ملنے گئی۔ مجھے دیکھتے ہی پہلا جملہ جو دادا ابا نے کہا وہ یہ تھا ''تو وعدہ کر کے بھول بھی جاتی ہے۔'' اور میں اتنی شرمندہ ہوئی کہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ

سرشام سوگئی تھی۔

دادا ابا کے دو بیٹے تھے۔ اکبر چچا اور اصغر چچا۔ اکبر چچا کلکتہ میں میڈیکل پڑھ رہے تھے اور اصغر چچا قریب ہی کسی شہر میں بی۔ ایس۔ سی کے طالب علم تھے۔ جب اکبر چچا اور اصغر چچا آتے تو گھر کی رونق دوچند ہو جاتی۔ خاندان کے لوگ یوں بھی دادا ابا سے ملنے جلنے آتے ہی تھے۔ ان لوگوں کے آنے پر آمدورفت اور بھی بڑھ جاتی۔ یوں بھی دادا ابا کی علمی صلاحیت اور قابلیت کی وجہ سے بہت سے مذہبی اور دیگر مسئلے پر اگر کسی کو الجھن ہوتی تو وہ ان کے پاس ضرور آتا۔ ایک بار مجھے یاد ہے۔ امی کو کوئی مسئلہ پوچھنا تھا۔ میں بھی امّی کے ساتھ گئی تھی وہ حسب معمول ادب سے پاس کی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ دادا ابا متوجہ ہوئے تو انہوں نے عرض مدعا کیا۔ دادا آبا نے فوراً مسئلہ سمجھا دیا۔ پھر مزید اطمینان کے لئے انہوں نے عطیہ پھوپھی کو اپنی بھاری گونجیلی آواز میں پکارا۔ وہ آکے پاس کھڑی ہوگئیں۔ انہوں نے ان کو بتایا کہ میرے سرہانے کتابوں کی جو الماری ہے اس کے پہلے خانے کی تیسری کتاب اٹھا کے لے آؤ۔ وہ کتاب لاتیں۔ دادا ابا نے کتاب کھولی۔ اس مشکل مسئلہ پر پہلے ہی سے داغ دیا ہوا تھا۔ پھر دادا ابا نے امی کو اطمینان کر دیا۔ شام کو اکثر مرد بھی دادا ابا سے ملنے آتے۔ جمیل احمد صاحب آتے تو وہ ان کے لئے کرسی ضرور منگواتے۔ بھتیجوں میں وہ ان ہی کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ ان کی بڑی لڑکی سے انہوں نے اکبر چچا کی منسوب ٹھہرائی ہوئی تھی۔ بڑی دیر تک ان سے باتیں کرتے۔ ایک بار دادا ابا نے کہا تھا ''جمیل احمد میں وضعداری ہے۔'' میں نے پہلی بار دادا ابا کو کسی کے بارے میں رائے دیتے سنا تھا۔ میں نے جب آئی۔ اے پاس کیا تو دادا ابا سے ملنے گئی۔ شہر آجانے کی وجہ سے اب دادا ابا سے بہت کم ملاقات ہو پاتی۔ دادا ابا نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''ارے حُسنو! تو نے تو ہم سے زیادہ پڑھ لیا اور میں شرمندہ سی ہوگئی۔ وہ تو علم کے بحر بیکراں تھے۔ میری حقیقت ایک قطرے بھر نہ تھی۔ میں گنگ سی کھڑی رہ گئی۔ وہ تعلیم نسواں پر اکبر کے اشعار پڑھتے رہے۔ ہم لوگوں کے بیٹھتے بیٹھتے مرغوں کے پیچھے نوکر دوڑنے لگے۔ کئی مرغ پکڑ لئے گئے۔ چاول میں دم دیا گیا اور منٹوں میں چھوٹی موٹی دعوت کا

انتظام ہو گیا۔ دادا ابا کے گھر کا نظام ایسے ہی مشینی انداز میں چلتا۔ بس احکامات دیئے جاتے اور تعمیل ہو جاتی۔

پھر اکبر چچا کی شادی کے ہنگاموں میں اس کا جانا ہوا۔ جمیل احمد کے یہاں تیاریاں زوروں پر تھیں۔ سالوں پہلے سے تیارے ہونے پر بھی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی سب کام پڑے ہوئے ہیں۔ ایک طرف کپڑے سل رہے ہیں۔ دوسری طرف زیورات گڑھائے جا رہے ہیں۔ فرنیچر بن رہے ہیں۔ چونا گردانی ہو رہی ہے۔ غرض کے کاموں کا ایک انبار تھا اور شادی سر پر تھی پچیس دن قبل کی بات ہے کہ

اچانک دوپہر کے وقت دادا ابا کے دروازے پر ڈاکیہ نے آواز دی۔ ایک ملازم تیزی سے اندر آیا۔ ''تار آیا ہے۔'' کیا! سب لوگ دہل گئے۔ الٰہی خیر کیجیو'' دادی اماں قبلہ رُخ انچل پھیلا کر کھڑی ہو گئیں۔ میرے اکبر کی خیر اصغر پر تیرا سایہ۔ ''عطیہ پھوپھی درود پڑھنے لگیں۔ نوکر نے دستخط کرنے کے لئے کاغذ دادا ابا کے ہاتھوں میں دیا۔ قلم ہاتھوں میں تھمایا۔ دادا ابا نے چشمہ آنکھوں پر لگایا۔ دستخط کیے لفافہ دادا ابا کے ہاتھوں میں آیا تو سارے لوگ کرسی کے گرد جمع ہو گئے۔ دادا ابا نے لفافہ پھاڑا۔ مضمون پڑھا۔ سارا خون کھینچ کر چہرے پر چلا آیا۔ سارے لوگ ان کا منہ تک رہے تھے۔ ''کیا ہوا'' دادی اماں برداشت نہیں کر سکیں۔ ''کہاں سے آیا ہے تار؟'' ''کلکتہ سے'' دادا ابا نے بھاری لہجہ میں کہا۔ ''اکبر تو خیرت سے ہے نا'' وہ بے چینی سے بولیں۔ اس کے دشمنوں کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔'' ''کاش کے اسے کچھ ہو جاتا۔ دادا ابا نے دھیمے سے کہا۔'' ''کیا ہوا ہے کچھ تو بولئے۔ ابھی ٹھہر جاؤ۔ دادا ابا کے لہجے سے سب کانپ گئے۔ منشی جی کو بلاؤ۔ منشی جی باہر سے دوڑے آئے۔ آپ ابھی کورٹ چلے جائیے۔ جمیل سے کہیئے گا۔ آپ کے چچا نے فوراً بلایا ہے۔'' دادا ابا آہستہ آہستہ کہنے لگے۔ سب لوگ دم سادھے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ دم تھا کہ حلق میں اٹکا ہوا تھا۔ کسی کو پوچھنے کی ہمت تھی نہیں۔ معاملہ کی نوعیت کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جب منشی جی چلے گئے تو دادا ابا کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر لیٹ گئے۔ اپنے چاروں

طرف دیکھا۔'پوچھوتم لوگوں کو کیا پوچھنا ہے۔''کس کا تار تھا اور کیا تھا؟'' دادی اماں کے سوا اور کوئی نہ بول سکا۔ کلکتہ سے ٹیلیگرام آیا ہے۔ اکبر کے ایک دوست نے خبر دی ہے کہ اکبر نے وہاں شادی کر لی۔ تھوڑی دیر کے لئے سب لوگ سانس لینا بھول گئے۔ دادی اماں آواز سے رونے لگیں۔ عطیہ پھوپھی نے چپکے چپکے آنچل سے آنسو پوچھنا شروع کر دیئے۔ ملازم معاملہ سنگین دیکھ کر آہستہ آہستہ کھسک گئے۔ دادا ابا آنکھیں بند کئے چپ چاپ لیٹے رہے۔

دادا ابا جنھوں نے آج تک کوئی غلط بات نہیں کی۔ جس سے جو کہا پورا کیا۔ کوئی عہد شکنی نہیں کی۔ سات سال کی بچی کو بھی اس کی وعدہ خلافی کا احساس دلانے سے باز نہ رہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جمیل احمد سے کیا کہیں گے۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتے۔ بار بار دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالتے۔ وہ بڑی شدت سے جمیل صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ جمیل احمد، جن کے یہاں شادی میں صرف پچیس دن باقی تھے۔ جہیز کا سارا سامان تیار تھا۔ مکان جگ مگ کر رہا تھا۔ تیاریاں تکمیل کو پہنچ چکی تھیں اور وہ لڑکی جو بیس سال سے ان کے لڑکے سے منسوب تھی۔ بیس سال سے جو رشتہ قائم تھا۔ جس کی ڈور دادا ابا جیسے بزرگ نے اپنے ہاتھوں باندھی تھی۔ وہ یوں ٹوٹ جائے کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ لوگ طرح طرح کی بات جوڑیں گے۔ لڑکی پر الزامات لگیں گے۔ پتہ نہیں اس کی اگلی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑے۔ کہیں یہ واقعہ اس کی ساری زندگی پر نہ چھا جائے۔ یہ سارے اندیشے انہیں پریشان کئے دے رہے تھے۔ بڑی دیر کے بعد جمیل احمد آئے۔ پریشان پریشان سے۔ سب لوگ ہٹ گئے۔ عطیہ پھوپھی کمرے میں چلی گئیں۔ دادی اماں چپکے چپکے روتی رہیں۔ بچوں کو باہر بھگا دیا گیا۔ دادا ابا کی بغل والی کرسی پر جمیل احمد بیٹھ گئے۔ دادا ابا نے انہیں بغور دیکھا۔ دادا ابا کی آنکھوں کے کنارے پر نمی دیکھ کر جمیل احمد گھبرا سے گئے۔

تمھیں دیکھتا ہوں تو تمہارا ہم شبیہہ دوسرا چہرہ میری نگاہوں میں آجاتا ہے۔ دادا ابا دھیمے دھیمے کہنے لگے۔ میرے بھائی نے جتنا مجھے چاہا شاید ہی کسی بھائی نے چاہا ہوگا۔ ہم دونوں بھائی ایک جان دو قالب تھے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ اس وقت میٹرک کا امتحان

شہر جا کے دنیا ہوتا تھا۔ اپنے قصبہ میں، میں سب سے پہلا لڑکا تھا۔ بھائی صاحب کہتے۔ خدا میرے بھائی کو اتنا بڑا بنا دے کہ میں اس کی بگھی کے پیچھے کھڑا ہو کر جاؤں۔ لیکن افسوس، ان کی دعاؤں نے مجھے اس قابل بنا تو دیا۔ لیکن یہ سب دیکھنے کے لئے وہ زندہ نہ رہے۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر آیا ہی تھا کہ اچانک قصبہ میں ہیضہ کی وبا پھیلی۔ ایک ایک گھر سے آٹھ آٹھ لاشیں ایک ساتھ نکلیں۔ حد یہ ہوا کہ گھر سے گور تک پہنچانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اس لپیٹ میں میرا گھر بھی آیا۔ ایک ساتھ ہم دونوں بھائی بستر پر گرے۔ دونوں بھائیوں کے کمرے کے بیچ ایک دیوار تھی۔ صبح کو بھیا بستر پر گرے اور شام کو انہیں قبر کی آغوش میں سلا دیا گیا۔ لیکن یوں کہ دیوار کے اس پار مجھے کانوں خبر نہ ہوئی۔ میری والدہ اپنا چہرہ خشک کر کے میرے پاس آئیں جوان سال بیٹے کا داغ سینے پر لئے۔ کئی بار مجھے شک گذرتا۔ دریافت کرتا۔ تو کہتیں۔ ابھی وضو کر کے تمہارے پاس آتی ہوں۔ میں سخت جان نکلا۔ بچ گیا۔ میں تم کو دیکھتا ہوں تو مجھے بھائی صاحب یاد آتے ہیں۔ کاش کہ تمہاری اقبال مندی دیکھنے کے لئے وہ زندہ رہتے۔ اکبر کا رشتہ میں نے تم سے نہیں۔ اپنے بھائی سے کیا تھا۔ وہ زبان میں نے تمہیں نہیں۔ اپنے بھائی کو دی تھی۔ افسوس کہ میں نے اپنے بھائی کی روح کو صدمہ پہنچایا۔ ان کے عزیز بچے کو میری ذات سے یہ گزند پہنچی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میرے بچے میرے بول کو یوں بے مول سمجھیں گے۔"

جمیل احمد ہکا بکا یہ سب سنتے رہے۔ وہ معاملہ کی نوعیت کچھ کچھ سمجھ رہے تھے۔ منتظر تھے کہ چچا کیا کہتے ہیں۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر دادا ابا نے ٹیلیگرام ان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اسے دیکھو۔ یہ میری موت کا پروانہ ہے۔" جمیل احمد تار دیکھ کر گم سم رہ گئے۔ وہ کیا کہتے۔ جب وہ اپنے بزرگ کو ہی اتنا ملول پا رہے تھے۔ بڑی دیر تک جمیل احمد اور دادا ابا خاموش بیٹھے رہے۔ کافی طویل خاموشی کے بعد دادا ابا نے کہا "جمیل میں نے تمہیں زبردست دھوکا دیا یہ کہہ کر وہ کراہنے لگے۔ کچھ ایسی ذہنی اذیت تھی جس کو وہ کہہ نہیں سکتے تھے۔ نہیں۔ آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ اس میں آپ کا کیا قصور۔ خدا ہی کو ایسا منظور تھا۔

نہیں! یہ تمہاری بھول ہے۔ خلق کی آواز میں خدا کی آواز ہوتی ہے۔ ہم کوئی وعدہ، جو کسی انسان سے کرتے ہیں۔ وہ وعدہ دراصل ہم خدا سے کرتے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ جمیل احمد بھی کچھ نہ بولے۔ پھر جب تک جمیل احمد بیٹھے رہے۔ دادا ابا مسلسل کراہتے رہے۔ وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔

جب آفتاب جھک گیا۔ دھوپ کے سائے دیواروں سے اترنے لگے۔ تو جمیل احمد اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسری صبح ان کا دروازہ کسی نے زور سے کھٹکھٹایا۔ قصبہ سے خبر آئی تھی۔ دادا ابا کا انتقال ہو گیا۔

جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو آنگن کے بڑے دروازے سے دادا ابا کا جنازہ نکالا جا رہا تھا۔ سامنے ہال میں بھاری بھر کم مہوگنی چھپر کھٹ تھی۔ سفید چادر کا شامیانہ سا بنا تھا۔ دادا ابا کا جسد خاکی اس پر رکھا تھا۔ دادا ابا...... جو پرانے وقت کی روشن یادگار تھے...... علم وقابلیت کا اونچا مینار۔ وہ اس دور کے نمائندہ تھے۔ جس میں وضعداری، آن، پاس زبان سے بڑھ کر دنیا میں کچھ بھی نہ تھا۔ دادا اماں نے مجھے بتایا کہ ساری رات دادا ابا کسی انجانے کرب میں مبتلا رہے۔ پچھلے پہر انہوں نے خدا سے دعاء کی۔ ''اے خدا! اب میری زبان بند کر دے تا کہ آئندہ میں کسی سے کوئی وعدہ نہ کرسکوں۔'' اور صبح ہونے سے پہلے دادا ابا کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی۔

☆☆

خامہ خونچکاں

وہ جہانگیر تو تھا نہیں کہ نور جہاں کو حاصل کرنے کے لئے شیر افگن کو میدان جنگ میں بھجوا دیتا۔ وہ تو ہمارے آپ کے ایسا ایک مجبور و بے بس انسان تھا۔ اس لئے اس نے خود کو گنگا کی لہروں کے حوالے کر دیا۔

ہم تو اس لمحے کو روتے ہیں۔ جبکہ اس نے اپنی محبت کا امین کاغذ کے چند پرزوں کو بنایا۔ کاش کہ اس نے اسے اپنا ہم راز نہ بنایا ہوتا۔ ہزاروں سینے ایسے ہیں جن کے نہاں خانوں میں محبت یوں دبی رہتی ہے کہ دل کو تو خبر ہوتی ہے۔ دماغ نا آشنا ہی رہتے ہیں۔ وہ بھی ان محبت کرنے والوں میں ہوتا کہ دل کو تو خبر ہوتی دماغ کو ہوا تک نہ لگتی۔ لیکن یہاں تو کاغذ کے پرزے کو شیر افگن تک پہنچنا تھا۔

پھر شیر افگن بھی کون۔ اپنا بھائی، اپنا ماں جایا — پھر وہ خود کو گنگا کی لہروں کے حوالے نہ

کرتا تو اور کیا کرتا۔ وہ لمحہ ...... ہائے وہ سنگین لمحہ ...... مہمانوں سے گھر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ مہمانوں کی خاطر و مدارت میں اتنا مشغول تھا کہ ایک بار بھی زنان خانے کی طرف نہ جاسکا۔ کسی لڑکے نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اندر آپ کو بلا رہی ہیں اور وہ اپنے ہاتھ کا پانی کا بھرا جگ دوسرے کسی کے ہاتھ میں تھما کر اس لڑکے کے ساتھ اندر چلا گیا۔ یہاں رنگ و نور کی دنیا میں وہ کھو گیا۔ زرق و برق لباس، حسین چہرے، زیورات کی چمک دمک۔ غازے اور لپ اسٹک کی خوشبوئیں۔ اتنی ساری خواتین۔ وہ گھبرا سا گیا۔ وہ چھپتا ہوا آگے بڑھتا گیا کہ کسی رشتہ کی بھابی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''چلو بھابی کو نہیں دیکھو گے۔ وہ اسے دلہن کے کمرے میں لائیں۔ مسہری طرح طرح کے رنگین قمقموں، پھولوں کی لڑیوں سے خود ہی دلہن بنی ہوئی تھی اور ان رنگین قمقموں اور پھولوں کے درمیان دلہن بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی نے گھونگھٹ اٹھا دیا اور وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹ گیا۔ ایک لمحہ کو اسے چکر سا آ گیا۔ سانس سینے میں اٹک سی گئی۔ وہ تو اس کا تخیل تھی۔ اسی کے خوابوں کا پیکر۔ دس سال پرانا پیکر۔ ایک مجسمہ۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا ایک تصویر کی پرستش کی۔ اسے پوجا۔ اسے چاہا نہ اس نے اسے کہیں دیکھا تھا نہ وہ کسی زندہ آدمی کی تصویر تھی۔ بس وہ تو اس کا تخیل تھی۔ اس نے پنسل اٹھائی اور اس تخیل کا اسکیچ بنانے لگا۔ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں سے اس میں رنگ بھرا۔ دوست کہتے ہیں وہ بڑا اچھا آرٹسٹ ہے۔ لیکن یار۔ بس، یہ ایک ہی تصویر، کیا کوئی دوسری تصویر تم نہیں بنا سکتے؟'' وہ ہنس پڑا۔ وہ ان سے کیا کہتا کہ نہ وہ آرٹسٹ ہے نہ اسے کوئی دوسری تصویر بنانے کی آرزو ہے۔ بس وہ تو اپنے دل کے صنم خانے میں آباد ایک تخیل کو کاغذی پیرہن پہناتا ہے۔ اسے رنگ دیتا ہے۔ نقش و نگار دیتا ہے اور پھر اس کی پرستش کرتا ہے۔ ہر سال یہ تصویر ایک ہی نقش و نگار کی تصویر بہتر سے بہتر بنتی جاتی۔ چودہ سال کی عمر میں اس نے اپنے تخیل کے خد و خال دیکھے تھے۔ تم اب میری نہیں رہیں۔ تم کسی اور کی بن چکی ہو۔ تم بے وفا ہو۔ دس سال میں نے تمہیں چاہا۔ تمہاری پرستش کی۔ کیا یہی میری محبت کا صلہ تھا۔ تصویر کی نگاہوں میں اس نے آنسوؤں کی نمی دیکھنے کی کوشش کی تو وہ تصویر جھینپ سی گئی۔ وہاں تو خوابوں کے لہرے

تھے آرزوؤں کی افق پر امنگوں اور حوصلوں کی قوس قزح۔ وہ بستر پر گر پڑا۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گذر گئی۔ صبح وہ بیماروں کی طرح بستر سے اٹھا۔ بھیا سسرال میں تھے۔ وہ سارا دن کمرے میں بند رہا۔ اس نے چاہا کہ دماغ کے افق پر کوئی دوسرا چاند چمک جائے۔ کوئی دوسری شبیہہ بناؤں۔ شاید کہ دل بہل جائے۔ یہ نہ سہی اور سہی اس نے پنسل اٹھائی۔ کاغذ پھاڑا۔ اسکیچ بنانے لگا۔ ایک گھنٹہ کی محنت کے بعد اس نے اسکیچ پر جو نظر ڈالی تو...... وہ تو وہی تھی۔ اپنی پوری معصومیت اور سادگی کے ساتھ۔ اس کے آگے کھڑی تھی۔ اس نے کاغذ مروڑ کے پھینک دیا۔ دوسرا کاغذ پھاڑا ...... دو گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد پھر...... پھر وہی تصویر...... اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ آج سے دس سال پہلے جو تصویر بن رہی تھی۔ آج بھی وہی بنی تھی۔ اس کے کچکچا کے پنسل توڑ دی۔ کاغذ کے پرزے پرزے کر دیئے۔ پھر پتہ نہیں۔ کون سا جنون سوار ہوا۔ دروازے سے برش نکالا۔ پاؤں کے نیچے دبا کر بیچ سے دو ٹکڑے کر دیئے۔ جھپٹ کے کینواس کے قریب پہنچا۔ پردہ کھینچ کے دور پھینک دیا۔ کینواس اتنی زور سے کھینچا کہ وہ پھٹ گئی۔ پھر اسے دھجیوں میں بانٹ دیا اور ان سب چیزوں کو جمع کر کے اس نے ماچس دکھادی۔ آگ کے شعلے بلند ہوئے اور وہ ایک آن میں اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کو جلتے دیکھتا رہا اور پھر...... ان کاموں سے فراغت پا کر وہ اتنا تھک گیا کہ گھنٹوں بستر پر پڑا رہا اور جلی ہوئی چیزوں کی راکھ اڑ اڑ کے اس کے بالوں، چہرے کو چومتی رہی۔ دوسرے دن بھیا آگئے۔ دلہن سمیت اور اس کے دل میں ایک درد کی لہر پھر اٹھی۔ اتنے دنوں پہ یہ احساس کہ وہ خیالی پیکر اس کے قریب نہیں ہے۔ اسے بڑا سکون تھا۔ اب اس کی یہ قربت کہ دیوار کے پیچھے وہ موجود ہے۔ اسے ایسا لگا کہ وہ برداشت نہ کر سکے گا۔ وہ اس کے کتنی قریب ہے اور کتنی دور۔ میرے اللہ۔ کیسی قربت، کیسا فاصلہ۔ وہ سارا دن کمرے میں بند رہا۔ شام کو بھیا آئے۔ کیا ہے۔ ظفر کیا کر رہے ہو! بھئی چلو باہر۔ کیا کمرے میں گھسے ہوئے ہو۔ کہو! ایک دن کیسا گزرا۔ میں تو تنہائی کے خیال سے تمہاری بھابی کو لے آیا۔ بھابی...... بھابی۔ وہ چپ چاپ انہیں تکتا رہا۔ انہوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے بازو سے اٹھایا۔ اندر لیتے چلے گئے۔

سامنے پلنگ پر وہ بیٹھی تھی اور اس کے جسم پر ہزاروں آنکھیں بن گئیں۔ اس نے اس کو ہزار آنکھوں سے ہمیشہ دیکھا تھا۔ بند آنکھوں سے۔ کھلی آنکھوں سے۔ نیند سے متوالی آنکھوں سے، اب ان آنکھوں کو بند کرنا ہوگا۔ اسے حقیقت تسلیم کرنا ہوگی۔ وہ کیسے اسے بھابی کہے گا۔ شاید وہ کبھی اسے بھابی نہ کہہ سکے گا۔ معاً اس کی نگاہیں اس کے ہونٹوں پر پڑیں۔ وہاں ...... وہاں ......اوپر ہونٹ پر ایک ویسا ہی تل بھی تھا۔ بالکل ویسا جیسا اس نے اپنی تصویر میں بنایا تھا۔ وہ سکتہ زدہ سا اسے دیکھتا رہا۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ دو نگاہیں، اس کی نگاہوں کو اپنی نظروں میں مقید کر رہی ہیں۔ وہ جلدی سے پلٹا۔ اس نے گھبرا کر بھیا کو دیکھا۔ لیکن ان نگاہوں میں کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے سادگی اور سرشاری کے۔ بھیا بہت خوش تھے۔ بہت مسرور، اتنا اس نے بھی محسوس کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے بھائی کی خوشیوں میں زہر گھولے۔ بڑی مشکل سے وہ خود کو وہاں سے سنبھال کے لے آیا۔ اس کے دیدار نے اور پھر اس مشابہت، اس مماثلث پر اس کا دل پہروں رویا وہ دن بھر کمرے میں بند رہا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کسی سے اپنے دل کا حال کہہ دے۔ اس صبر آزما حقیقت سے کسی اور کو آگاہ کر دے۔ یہ غم جو اتنا بھاری ہے کہ لگتا ہے اس کا کمزور دل نہ پار پا سکے گا۔ اگر اس نے کسی کو اس کا شریک نہ بنایا تو وہ پسلیاں توڑ کر نکل جائے گا۔ غم کا فلسفہ ہے کہ کوئی اس کا شریک ہو جائے۔ کوئی ایسی ہستی مل جائے جو دو گھڑی ساتھ بیٹھ کے آنسو بہا لے تو اس کا بوجھ آدھا ہو جاتا۔ لیکن غم اگر تنہا دل ناتواں پر جھیلنا پڑے ایسے کہ اس کا سایہ بھی کسی پر نہ پڑے، دل روئے اور خود مسکرانا پڑے تو ایسا غم بہت جان لیوا ہوتا ہے۔ اس کے بوجھ سے دم گھٹ گھٹ جاتا ہے اور اس کا بھی آج دم گھٹنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ در و دیوار سے لپٹ لپٹ کے روئے۔ صوفے کرسیوں سے اپنی داستانِ مسرت و غم سنائے ...... وہ کیا کرے۔ یہ بے جان چیزیں، اس کے آنسو تو نہ پونچھتیں۔ اسے اپنے سینے سے تو نہ لگاتیں۔ اس سے اور کچھ نہ بن پڑا۔ تو اس نے تکیے کے نیچے سے اپنا لیٹر پیڈ نکالا اور پھر وہ بھول گیا کہ وہ کون ہے۔ کس کو مخاطب کر رہا ہے۔ حالات کیا ہیں۔ رشتے کی نزاکت کیا ہے۔ وہ کھل گیا۔ اب وہاں اور اس کے تخیلی پیکر کے

سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ دس سال۔ دل کے سمندر کے اندر بسے ہوئے جذبات میں آج جوار بھاٹا آ گیا تھا۔ وہ لاوے اگلنے لگا۔

میری محبوبہ، میری زندگی، میری نوری! ہاں۔ میں تمہیں ہی کہوں گا۔ تم سراپا نور ہو، وہی نور جس نے شہنشاہ جہانگیر کی دنیا میں اجالا ہی اجالا بکھیر دیا تھا۔ وہ اجالا جو راہِ حق میں بھٹکنے والے ہر انسان کی راہوں کو اچانک منور کر دیتا ہے۔ میں شہنشاہ جہانگیر تو نہیں، کاش کہ میں شہنشاہ جہانگیر ہوتا۔ کاش کہ شیر افگن میرا ماں جایا نہ ہوتا۔ پھر یہ راہیں کتنی منور، کتنی روشن ہوتیں۔ دس سال سے میں نے تمہیں چاہا۔ تمہاری پوجا کی۔ میں میٹرک کا ایک کمسن سا طالب علم جب میں نے پہلی بار تمہاری تصویر اپنے اسکول کی کاپی پر بنائی تھی۔ بغیر دیکھے، بغیر سنے، تخیل نے ایک پیکر کو جنم دیا تھا اور وہ پیکر کاغذی لباس پہنے میرے سامنے موجود تھا۔ میں سربسجود ہو گیا اور ہر سال میں تمہارے تن سیمیں کو ایک نیا لباس پہناتا رہا اور اپنے خانۂ دل میں سجاتا رہا کہ تم...... میرے قریب آتیں کہ خدا کی قسم اتنے قریب کہ میں تمہیں چھو سکتا تھا۔ تمہیں پا سکتا تھا۔ لیکن...... لیکن...... میرے ہاتھ کے ساتھ ایک زنجیر بڑھی، رشتے کے تعلق کی حالات کی بھاری زنجیر اور میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ تم مجھ سے بہت دور ہو گئیں...... بہت دور!"

اور بڑی دیر تک وہ لیٹر پیڈ پر جھکا لکھتا رہا۔ لکھتا رہا کہ اچانک شام کا دھندلکا کھڑکیوں اور دروازوں سے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے سر اٹھایا، خط بند کیا اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کا دل ہلکا ہو گیا ہو۔ وہ بڑی دیر تک بستر پر پڑا رہا۔ دماغ ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔ جیسے ابر سے جھکا جھکا آسماں برس جانے کے بعد صاف ہو جائے۔ ویسے ہی اس کا ذہن صاف ہوتا گیا۔ اسے اب محسوس ہوا کہ وہ اس غم کو سہار سکے گا۔ اگر اس طرح اس کا ذہن صاف ہوتا گیا تو وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ دو مہینے کے بعد وہ کالج کھلنے پر چلا جائے گا۔ پھر دوسرا ماحول، کالج کی کھلی فضا، سب سے بڑھ کر اتنا لمبا فاصلہ۔ وہ ضرور خود کو بہلا لے گا۔ بس یہ دو مہینے۔ یہ دو مہینے کسی طرح بیت جائیں۔ اس کے بعد وہ ان خطوں کو نذرِ آتش کر دے گا۔ یوں کہ ایک ہاتھ سے ماچس دکھائے گا۔ دوسرے کو خبر

بھی نہ ہوگی۔ وہ ہر روز ایک خط لکھتا رہا اور اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرتا رہا۔ دن بھر پریشان خیالوں، مایوسیوں سے اس کا دل و ذہن بوجھل ہو جاتا۔ بھرا بھرا سا وہ رات ہونے کا انتظار کرتا۔ جب وہ اس کی تاریکی میں کاغذ کے چند اوراق کو اپنی داستان غم سنائے گا۔ اپنے سینہ چیر دے گا۔ آنسوؤں میں قلم ڈوبتا رہے گا اور اوراق کے سینے داغدار ہوتے رہیں گے۔ وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ سب کچھ...... نہ اس وقت اس کا کوئی بھائی ہوتا نہ اس تخیل سے اس کا کوئی رشتہ ہوتا۔ سوا اس کے کہ وہ اس کے خوابوں کا پیکر ہے۔ اس کی زندگی ہے۔ اس کی آرزو ہے۔ اس کی محبوبہ ہے اور بس!

کاش کہ اس نے کاغذ کو اپنی محنت کا امین نہ بنایا ہوتا۔ کاغذ، وہ بے جان ٹکڑا ہے۔ جسے کسی نے ہاتھ لگایا تو نہ چیخا نہ چلایا۔ نہ اس نے جھوٹی قسمیں کھائیں۔ نہ کسی کے راز کا احترام کیا۔ وہ تو اپنا سینہ چاک کیے۔ آنکھوں میں پتلیاں بن کے ناچتا رہا اور ورق پر ورق پلٹتے رہے۔ کاش کہ اسے ایسا جان لیوا بخار نہ آیا ہوتا۔ وہ یوں ہوش نہ کھوتا، محفوظ کرنے کی کوشش بھی نہ کر سکے۔ یوں کہ ہاتھ بڑھا کے ان کاغذ کے پرزوں کو دراز میں ڈال دے۔ بکس میں چھپا سکے۔ بس وہ تو ساری رات بڑبڑاتا رہا اور اس کے سارے جسم پر کوئلے دہکتے رہے۔ صبح کے وقت کیا ہوا، کون آیا؟ اسے کیا خبر۔ شاید ڈاکٹر کے نسخہ لکھنے کے لئے شیر افگن نے جہانگیر کے سرہانے سے نامۂ محبت کھینچ لیا اور پھر...... جب اس کی آنکھ کھلی تو سرہانے سے لیٹر پیڈ غائب تھا۔ اسے بڑے زور سے چکر آیا۔ سانس سینے میں الجھ گئی۔ نقاہت کے باوجود وہ اٹھ بیٹھا۔ ایک بار اس نے ایسا محسوس کیا کہ سارا کمرہ گھوم رہا ہے۔ پلنگ، کرسیاں سب گردش میں ہوں۔ وہ خود چکرا کے گرنے لگا کہ حالات کی سنگینی نے اسے بڑھ کر سہارا دیا۔ اس نے کلینڈر پر نظر ڈالی۔ ایک ہفتہ بڑھی ہوئی تاریخ تھی۔ اف! جو ہونا تھا، ہو چکا ہوگا۔ اس نے کیا کیا نہ لکھا تھا۔ وہ پرزے تو اس کے ہمدم و ہمراز ہی ٹھہرے۔ وہ کیا جانتا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی قضا بلائی ہے۔ قضا جو آچکی ہے۔ جو اٹل ہے۔ جسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ وہ باہر نکلا۔ برآمدے پر کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ لاتعداد پرزے یوں کہ کوئی انہیں پڑھنا چاہے تو پڑھ نہ سکے۔ لیکن...... کیا

وہ ان کاغذی پرزوں کو نہیں پہچانتا تھا۔ وہ لاکھوں پرزوں کے انبار میں سے بھی آنکھیں بند کر کے
ان پرزوں کو چن سکتا تھا۔ وہ ان پرزوں کو چنتا گیا۔ پاس ہی اس کے بھیا کا کمرہ تھا۔ اس کے قدم
خود بخود بڑھنے لگے۔ اس کے کانوں میں سسکیوں کی آواز آئی اور وہ جہاں تھا وہیں تھم گیا۔
سارے جسم کا خون کانوں میں سمٹ گیا۔ وہی ہوا۔ جس کی توقع تھی۔ کوئی مسلسل سسکیوں سے رو
رہا تھا۔ پھر ایک آواز آئی۔ نسوانی آواز۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی۔ لیکن ...... لیکن ...... آپ ہی
سوچئے اس میں میری کیا خطا ہے، کیا قصور ہے۔ اگر اس میں میری کوئی خطا نظر آئے تو مجھے جو سزا
تجویز کیجئے۔ میں بھگتنے کو تیار ہوں'' میں تمہیں تو کچھ نہیں کہتا۔ یہ آواز بھیا کی تھی۔ وہ پہچان نہ سکا
کہ وہ بھیا ہی کی آواز ہے۔ وہ زندگی سے بھرپور۔ مسرتوں سے سرشار آواز ...... نہیں ...... نہیں یہ تو
کسی شکست خوردہ انسان کی آواز تھی۔ کسی بازی ہارے ہوئے جواری کی آواز۔ اس آواز میں
زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ حیات کی کوئی توانائی نہیں، نام کو بھی نہیں ...... اس کے آگے وہ کچھ نہ
سن سکا۔ وہ اب ہو کے رہے گا۔ جو کاتب تقدیر لکھ چکا ہے۔ اس کے جسم میں طاقت ہی طاقت بھر
گئی۔ کسی انوکھے عزم کی طاقت۔ کسی ارادے کی طاقت۔ ایک نئے جذبہ کی طاقت، وہ اپنے
کمرے میں آیا۔ اپنی کاپی سے ایک کاغذ پھاڑا۔

''بھیا، میرے باپ۔ میری ماں۔ میری بہن۔ دنیا کا کون سا رشتہ ہے۔ جس کو میں نے
آپ کی ذات میں نہ پایا۔ آپ نے تنہا مجھے سب کی محبتیں دیں۔ خدا نے ہم دونوں کو تنہا اتنی بڑی
دنیا میں بھیجا۔ لیکن میں نے آپ کے وجود میں، ماں باپ، بھائی بہن کی ساری محبتیں پائیں۔
مجھے کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ بھیا میں آپ کی دنیا سے جا رہا ہوں۔ بھیا، میرا غم نہ کرنا۔
اپنے بدنصیب بھائی کو بخش دینا۔ آپ کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ بھیا! خدا کی قسم اس خط کے سوا
میری کوئی داستان نہیں۔ سارا افسانہ اسی خط تک محدود ہے۔ اس کے آگے کچھ بھی نہیں۔ میں، میرا
قلم اور کاغذ کے یہ پرزے۔ اس کے علاوہ اور کوئی اس کا شریک نہیں ...... بھیا! دوسری ہستی، وہ
دوسری ہستی۔ ایسی ہی معصوم اور پاک ہے۔ جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ۔ جو نہ کسی محبت سے آشنا ہوتا

ہے اور نہ کسی نفرت سے۔

بھیا! بس مجھے معاف کردو۔ میرے بھائی! مجھ خطا کار کو بخش دو۔

تمہارا بدنصیب بھائی

ظفرالزماں

تیسرے دن اخبار کی اس سرخی کو کسی نے پڑھا۔ کسی نے پڑھا بھی نہیں کہ

سائنس کالج کے پروفیسر قمرالزماں کے بھائی کی لاش آج سویرے گنگا کے کنارے ملی۔ دو دن سے لوگ ان کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ڈاکٹری معائنہ سے پتہ چلتا ہے۔ موت دو دن پہلے ہوئی ہے۔ لاش اب اوپر آئی ہے۔ موت کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔

☆☆

ایک تبسم کے لئے

ہوا کو کس نے مٹھی میں بند کیا ہے۔ جو وہ کر لیتی بھلا۔ بڑی اماں کا شاید دماغ چل گیا ہے۔ سوچا تھا کہ مٹھیوں میں لمحے کو اسیر کر لیں گی۔ زندگی کا لمحہ۔ حیات کا لمحہ۔

لیکن ...... لیکن ...... مٹھی میں کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ تو خالی ہے — بالکل خالی۔ وہ خالی مٹھی تکتی رہیں۔ انہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ —— نو سال کی ننھی منی بچی، دبلی پتلی سی۔ سنہری سنہری بچی۔ کانوں میں ہلکی ہلکی بالیاں۔ گلے میں ننھا ننھا نیکلس۔ ہاتھ میں پھولوں کا ہار، سرخ دوپٹہ سر پر سنہرا لچکا لگا ہوا۔ سید صاحب نے گود میں لا کر اسے نانا کی گود میں بٹھا دیا۔ وہ گھبرا گئی۔ گھبرائی سی اپنے چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ چھوہاروں کی سینیاں۔ یہ مسند، یہ چوکیاں۔ اس نے نانا کے بازو میں سر چھپا لیا۔ پھر ننھا سا دولہا آیا۔ گیارہ سال کا دبلا پتلا لڑکا۔ سفید چوڑی دار پیجامہ۔ عنابی کمخواب کی شیروانی، گھنگریالے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے گلے میں پھولوں کے ہار۔ نانا کے دوسرے زانو

پر وہ بیٹھ گیا۔ قاضی جی نے قرآنی آیات پڑھنا شروع کیں۔ وہ نانا ابا کے کندھے سے لگی نیم غنودہ سی یہ سب دیکھتی رہی۔ پھر مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔ وہ ہنگامے میں گھبرا کر رونے لگی۔ کسی نے اس کے ہاتھوں میں چھوہارے تھما دیئے اور وہ خاموشی سے کھانے لگی۔ پھر وہ چپکے سے نانا کی گود سے سرک آئی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ کوئی اسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ دوڑ کر زنان خانے میں گھس آئی۔ بڑی اماں اس کی منتظر تھیں۔ اس نے ماں کی گود میں منہ چھپا لیا۔ بڑی اماں نے اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔ اس کی امیدوں کا واحد مرکز۔ اس کی زندگی۔ وہ اسے پیار کرتے نہ تھک رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ ننھا سا دولہا بھی اندر آ گیا تھا۔ اسے خبر نہ ہوئی۔ جب اماں نے اسے اتار کر دولہا کو گود میں لے لیا۔ تو وہ حیران سی دیکھنے لگی۔ "میرے چاند، میرے بیٹے، خدا تجھے یہ خوشی مبارک کرے۔ تیری نانی اماں کو حیات دے۔ شفا دے اور پھر وہ اسے ایک کمرے میں لائیں۔ سفید بستر پر ایک بوڑھی ضعیفہ پڑی تھیں۔ سارا جسم بیجان تھا۔ صرف پتلیاں گھومتی تھیں۔ انہوں نے ان دونوں کو اشارے سے بلایا۔ اس کی پیشانی چومنی چاہی تو وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گئی۔ ماں نے قریب کرنا چاہا تو ماں سے چمٹ گئی۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں بڑی بی نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ لیجئے، خالہ امی۔ خدا آپ کو نواسہ اور بہو مبارک کرے۔ ضعیفہ نے اپنے ٹھنڈے سوکھے ہونٹ اس کی پیشانی پر لگا دیئے۔ وہ گھبرا کر رونے لگی۔ اسے ایسا لگا، جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اسے ضعیفہ کے قریب لئے جا رہی ہو۔ لیکن اس کا ننھا سا دولہا ضعیفہ کے سینے سے لگا اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ پھر ماں اسے عورتوں کے ہجوم میں لے آئیں۔ عورتوں نے بڑھ کر اس کی بلائیں لیں۔

"خدا خالہ امّی کی اس آرزو کو پورا کرے۔ خود شفایاب ہو کر دونوں کے سہرے باندھیں۔"

خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن مجھے تو کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر بھی جواب دے چکے ہیں۔"

"بڑا اچھا کیا۔ بی، تم نے مرنے والی کی آرزو پوری کر دی۔ خدا تمہارے بھاگ سے رضوان کو لائق بنائے۔"

"ہاں! بہن، دعاء کیجئے۔ میں نے تو اپنی بزرگ کی خواہش کا احترام کیا ہے۔" لیکن

عورتوں کے ہجوم میں کچھ ایسی بھی تھیں جو آپس میں چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔

یہ کیا سوجھی تھی، بھلا سید صاحب کو۔ ایسی خوبصورت گڑیا سی بچی کو شکنجوں میں جکڑ دیا۔ بچپن کی شادی بھی کہیں قابل ستائش ہوتی ہے۔ کون جانے رضوان کیسا نکلے گا۔'' ہاں بہن! اور کیا۔ نہ ماں کا سایہ نہ باپ کا۔ صرف ایک نانی ہے، ان کا بھی چل چلاؤ ہے۔

گڈے گڑیوں کا بیاہ رچایا ہے۔ یہ تو ماں باپ کی خوشی ہوئی۔ ورنہ اولاد کے لئے انہوں نے کیا دیکھا۔ کچھ بھی نہیں! یہ سب وہ سنتی اور کچھ نہ سمجھ پاتی۔ کیا ہو رہا ہے۔ کیا نہیں ہو رہا ہے۔ پھر دوسرے دن اس ضعیفہ کا انتقال ہو گیا۔ جس سے اسے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ گھر جہاں کل شادی کی مبارک سلامت کا شور تھا۔ وہاں کفن دفن کی تیاریاں تھیں۔ شاید یہیں سے نحوست کی ابتدا ہوئی تھی۔ وہ خوشی جس کی بنیاد موت پر رکھی گئی ہو۔ اس کا کیا انجام ہوتا آخر! وہ یہ سب دیکھتی رہی۔ بالکل بے تعلق سی۔ الگ تھلگ۔ اس نے دیکھا۔ وہ ننھا سا دلہا پچھاڑیں کھا رہا ہے۔ لوگ اسے سنبھال رہے ہیں۔ وہ سنبھلتا نہیں ہے۔ وہ کیوں رو رہا ہے۔ آخر'' کیا ہو گیا اسے؟ کل تو وہ اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ سوچتی رہی۔

پھر وقت کے معلم نے آہستہ آہستہ اسے ہر بات سکھا دی۔ ہر شعور کو ابھارا۔ وہ ننھا سا دلہا چپکے چپکے اس کے قریب آتا گیا۔ دل و دماغ پر چھاتا گیا۔ وہ اس کا دلہا ہے۔ یہ احساس سرور بن کر اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا۔ ماضی کی کھڑکیاں کھلتیں اور اس میں رضوان دولہا بنا، کمخواب کی شیروانی، چوڑی دار پیجامہ پہنے اپنی طرف جھانکتا نظر آتا۔ اس کے تصور میں اس کے دل و دماغ میں وہ چھوٹا سا دولہا رچ بس گیا۔ اب وہی رضوان، وہی دبلا پتلا لڑکا۔ بائیس سال کا خوبصورت شہزادہ تھا۔ وہ اکثر اس کے یہاں آتا۔ باہر کے کمرے میں ٹھہرتا۔ کبھی کبھی کھڑکی کی طرف نادانستہ اس کی نظریں اُٹھ جاتیں تو اسے کوئی سایہ ہٹتا ہوا نظر آتا اور وہ گلابی گلابی سی ہو جاتی۔ اکثر جب بڑی اماں دوپہر کو سو جاتیں اور صحن میں اکیلی ہوتی تو کوئی آہستہ سے اپنے کمرے کا پردہ سرکا دیتا اور وہ...... اس کے قدم تھم سے جاتے نہ وہ ادھر آسکتی نہ ادھر جا سکتی۔ درمیان میں وہ دروازہ

تھا۔ جس کا پردہ سرکا کر اس کا محبوب اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ پسینے پسینے ہو جاتی۔ غزالی آنکھوں پر پلکوں کی چلمن سی پڑ جاتی۔ رخسار شرم کی آنچ سے دہکنے لگتے اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ رضوان کی نظریں دم بخودی اس کے چہرے کا طواف کئے جا رہی ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ کبھی کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی۔ رضوان نے کبھی اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہا۔ جب بھی وہ آتا، صرف اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا۔ وہ یہ سمجھتی تھی اس لئے کوشش کے باوجود اس کی اس خواہش کو رد نہ کر پاتی۔ پھر کسی وقت رضوان باہر جاتا تو کمرہ کھلا چھوڑ دیتا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے کمرے کو درست کرنے ضرور آئے گی۔ وہ چپکے سے اس کے کمرے میں چلی جاتی۔ بستر کی شکنوں کو اپنی نازک نازک انگلیوں سے درست کرتے ہوئے وہ کہیں کھو جاتی۔ تکیہ پر سے سر کا داغ مٹاتے مٹاتے اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ کتابوں کو وہ سیلف پر رکھتی۔ جوتوں کو اسٹینڈ پر، ——— اترے کپڑوں کو دھو ڈالتی۔ سکھا کر، استری کر کے پھر چپکے سے اسے بستر پر رکھ آتی۔ جب وہ آتا۔ وہ دن بھر اس کے کاموں میں مصروف رہتی۔ جب تک وہ رہتا مسرت سے اس کا انگ انگ ڈولتا۔ آنکھوں میں سرور کا نشہ سا چھایا رہتا۔ کوئی نامہ و پیام نہ تھا۔ کوئی خط و کتابت نہ تھی۔ لیکن یہ احساس کہ اس کا جیون ساتھی، اس کا محبوب، اس کا شریک حیات، اس کے قریب ہے، اسے سارا دن مخمور رکھتا۔ جاتے وقت رضوان اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا۔ یہ وہ جانتی تھی۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر یوں صحن سے دوسرے کمرے کی طرف جاتی کہ رضوان اس کی ایک جھلک دیکھ لے۔ پھر رضوان مطمئن سا رخصت ہو جاتا، وہ کئی دن کھوئی کھوئی سی رہی۔ بڑی اماں یہ سب جانتی تھیں سمجھتیں تھیں۔ وہ منتظر تھیں کہ ان کے بچوں نے بزرگوں کی پسند کو اپنی پسند بنا لیا تھا۔ ورنہ کیا ہوتا۔ اگر یہ دونوں اس رشتے کو ناپسند کرتے۔ وہ یہ سمجھتی تھیں، انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ شرجیل کو رضوان سے الگ رکھیں۔ رضوان کا حق شرجیل پر مجھ سے زیادہ ہے۔ وہ جلد سے جلد ان کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ شادی کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ وہ شادی کی تیاری میں کھو کر اکثر گنگنانے لگتیں۔ سہاگ، شہانے بول ان کے ہونٹوں پر مچلنے لگتے۔

دوپہر کو بھی وہ شرجیل کے دوپٹے، جمپر وغیرہ میں لچکے ٹانکنے میں گزار دیتیں۔ سرجیل ماں کی دن رات کی جانفشانی دیکھتی۔ چاہتی کہ ماں کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن شرم دامن گیر ہو جاتی۔ پھر وہ زیادہ سے زیادہ کام بارچی خانہ کا خود کر لیتی تاکہ بڑی اماں اس کے علاوہ کوئی اور کام نہ کریں۔ دوپہر میں جب وہ اپنے کمرے میں لیٹتی تو خوابوں کی وادیوں میں شہنائیوں کی گونج میں اسے رضوان کا چہرہ نظر آتا۔ ہنستا مسکراتا چہرہ۔ وہ شرما سی جاتی۔ اسے ایسا لگتا کہ کمخواب کی شیروانی، چوڑی دار پائجامہ پہنے۔ پھولوں سے لدا پھندا اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ قریب اور قریب...... اس نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے ہالے میں لے لیا ہے۔ وہ شرما کر سر جھٹک دیتی۔ پھر وہ آنکھیں بند کر لیتیں اور کوئی بابل کے گیت گاتا۔ فضاؤں میں درد بھری تانیں اُبھرتیں۔

پی کے گھر آج پیاری دلہنیا چلی رو ئیں ماتا پتا ان کی دنیا چلی

وہ ڈولے میں رخصت ہو جاتی۔ اس کا دل بھر آتا۔ بڑی اماں کی تنہائی کے خیال سے اس کی آنکھیں چھلکنے لگتیں۔ پھر وہ اپنے دل کو تسلی دیتی۔ نہیں وہ تو اپنی ماں کے پاس رہے گی۔ رضوان کو نہ باپ ہیں نہ ماں۔ وہ اپنی امّی کے پاس ہی رہے گی۔ وہ کہاں جائے گی بھلا۔ تصوّر میں وہ سُرخ سرخ حنائی ہاتھوں سے اپنی ماں کے آنسو پونچھتی۔ ماتھے کا ٹیکہ سنوارتی۔ دور اپنے پیا کے گھر چل دیتی۔ پھر ایک دن جب وہ خوابوں کے انہیں تانے بانے میں کھوئی تھی کہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی پیشانی تپ رہی ہے۔ وہ آنکھیں نہیں کھول پا رہی ہے۔ سر بھاری بھاری تھا۔ بڑی اماں نے دیکھا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسے شدید بخار تھا۔ بخار نے طول پکڑ لیا۔ بڑی اماں کا کوئی ہاتھ بٹانے والا نہ تھا۔ جہیز کا سامان اِدھر اُدھر پڑا تھا۔ بڑی اماں نے جہیز کے سارے سامان کو جلدی جلدی ایک بکس میں ٹھونس دیا۔ پتہ نہیں! کیوں ایسا کرتے ان کا دل الٹا جاتا۔ ان کا دل چاہتا کہ وہ یہ نہ کریں۔ لیکن وہ یہ نہ کرتیں تو کیا کرتیں۔ کون تھا جو یہ سب سنبھالتا۔ جس کے دم سے سب کچھ تھا وہ تو بستر پر پڑی تھی ویسے بھی پتہ نہیں کیوں شرجیل کی طرف سے ہمیشہ ان کو دھڑکا لگا رہتا۔ وہ سر کے درد کا بھی نام لیتی تو وہ دھک سے رہ جاتیں۔ ان کا دل چاہا،

کہ رضوان کو خبر دے دیں۔ لیکن پھر سوچا بچّہ ہے، پریشان ہو جائے گا۔ خدا اسے صحت مند کر دے
تو اب وہ دولہا ہی بن کر آئے گا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بخار کی طوالت سے گھبرا کر
انہیں خبر کرنی ہی پڑتی۔ رضوان حواس باختہ سے گھر آئے۔ کیا ہوا، خالہ امّی، میں تو انہیں اچھا بھلا
چھوڑ کر گیا تھا۔ رضوان خود سے بولے جا رہے تھے۔ آج شرجیل پر بدحواسی طاری تھی۔ آنکھیں
بڑی مشکل سے کھولتی۔ رضوان چاہتے تھے کہ انہیں دیکھنے کی اجازت مل جائے۔ پہلے کی طرح وہ
صحن میں اپنی ایک جھلک اسے دکھائے۔ لیکن بڑی اماں کو یہ سب بدشگونی سے لگتی۔ وہ اسے یوں
سامنے دیکھے گی تو گھبرا جائے گی۔ سمجھے گی پتہ نہیں ڈاکٹروں نے کیا کہہ دیا ہے کہ امّی نے انہیں
سامنے کر دیا۔ لیکن حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ پہلے تو شرجیل کو یہ بیماری معمولی سی تکان کا نتیجہ
معلوم ہوئی۔ تھوڑا سا افسوس ہوا کہ امی کی مصروفیت بڑھ جائے گی۔ اس نے چاہا کہ امی کو منع کر
دے کہ جب تک وہ اچھی نہ ہو جائے۔ امی اپنا کام ملتوی کر دیں۔ اس نے دبے لفظوں میں ماں
سے کہہ بھی دیا۔ ماں نے کہا ”نہیں بیٹا، مجھے کون سی مصروفیت ہے۔ اب میں جلد سے جلد اس
فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔ جتنی دیر ہوگی۔ دیر ہوتی جائے گی۔ وہ اسی کے پاس لچکہ اور
دوپٹہ لا کر ٹانکتی رہیں۔ وہ آنکھیں بند کئے خواب دیکھتی رہی وہ سنیں گے تو کتنا گھبرائیں گے۔ امّی
انہیں خبر کر دیں۔ حواس باختہ سے آئیں گے۔ میں ان کی بدحواسی دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ اوٹ
پٹانگ سوچتی رہی لیکن ...... یا اللہ یہ دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے کیا کوئی بری بات ہونے والی ہے۔
کیسا سناٹا ہے۔ کچھ بولنے کو جی نہیں چاہتا۔ امی بھی میری خاموشی سے پریشان ہو جائیں گی۔
سنتے ہیں جب موت قریب آجاتی ہے تو زبان بند ہو جاتی ہے۔ یا اللہ! میں یہ کیا سوچنے لگی۔“ وہ
گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی ہے لیکن شاید زبان بندی کا وقت آگیا تھا۔ ایک صبح اس نے آنکھیں
کھولیں سرہانے کی طرف نظر گھمائی تو ماں کو جانماز پر دیکھا۔ چہرہ شدت گریہ سے تمتمایا ہوا،
آنکھیں لہو روتی ہوئی۔ یہ کس کے ارمانوں کا خون ہے پروردگار۔ امی کیوں رو رہی ہیں۔ چاہا کہ
ماں سے پوچھے۔ لیکن۔ ارے اس کے منہ سے تو کوئی آواز ہی نہیں نکل رہی ہے۔ اس نے چیخنا

چاہا۔لیکن دم گھٹ گیا۔ بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا۔ دل الٹ سا گیا۔ پسینہ سے شرابور
ہوگئی۔ ''شاید وقت آ گیا۔ یا اللہ! کیا حقیقتاً ایسا ہو جائے گا۔ نہیں! نہیں!! میرے مولا! نہیں۔ میں
نے اس دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے پروردگار! میرے ارمانوں پر رحم کر۔ میرے خوابوں کو شرمندۂ
تعبیر کر دے۔'' آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ''میری ماں'' اس کے ہونٹ کانپنے
لگے۔ ''مالک اس ہستی پر رحم کرنا۔ اس عمر میں کوئی زخم انہیں نہ لگے۔ رضوان ہائے رضوان۔ سنا
ہے وہ آ گئے ہیں۔ یا اللہ! اس بار انہوں نے مجھے اب تک نہیں دیکھا۔ امّی۔ انہیں میری ایک
جھلک دکھا دیجئے۔ مالک! میں زندہ رہوں گی۔ اے زندگی دینے والے! مجھے زندگی بخش دے۔
اپنی ماں کے لئے۔ اپنے محبوب کے لئے۔ پروردگار! خود میرے لئے۔ ابھی تو میری دنیا میں
رنگوں کی خوشبو، شہنائی کی مہک ہے۔ گیتوں کا نور ہے۔ مجھے موت کی تاریکیوں سے بچا۔ میرا دل
ہائے! یہ میرے دل کو موت کا یقین سا کیوں ہونے لگا۔''

پھر بڑی امّاں نے اس کی آنکھوں کی یہ بے بسی پڑھ لی۔ بیٹی سے حال پوچھا۔ وہ کچھ بول
نہ سکی۔ حسرت سے ماں کو تکا کی اور ماں، ماں کا دل پھٹ گیا۔ مالک! کیا اسی دن کے لئے تو نے مجھے
زندہ رکھا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کے روئیں۔ آؤ۔ تمہیں اس سے ملا دیں۔ تمہیں تمہارا حق دے دیں۔
انہوں نے رضوان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''دیکھو! تم شکایت نہ کرنا بیٹے! میں نے اپنا فرض ادا کر دیا، میرے
لال!'' وہ رضوان کو اس کے کمرے میں لے گئیں۔ ''مناؤ سہاگ رات۔ یہ ہے تمہاری سہاگ
رات''۔ وہ پاگلوں کی طرح کمرے سے نکل گئیں اور اس نے نگاہیں پھریں تو رضوان کو سامنے دیکھا۔
''ارے'' اس کا دل اچھل کے منہ میں آ گیا۔ وہ آ گئے۔ یا اللہ! میرا ہاتھ تو اٹھتا ہی نہیں کہ میں
گھونگھٹ میں اپنا منہ چھپالوں۔ ہائے اللہ! ماتھے پر ٹیکہ بھی نہیں۔ امّی نے مہندی بھی نہیں لگائی۔
بالکل سفید سفید ہاتھ ہیں۔ ہائے! وہ مجھے کیسے تکے جا رہے ہیں۔ نہ جامے دار کی شیروانی ہے نہ
چوڑی دار پاجامہ ہے۔ کہاں گیا وہ خوابوں کا شہزادہ، نہ گھوڑا ہے نہ ڈولا۔ نہ شہنائی ہے نہ بابل کے
گیت۔ کیا۔۔۔۔۔کیا۔۔۔۔۔حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔۔۔۔۔مولا! یا اللہ!! یہ میری آنکھیں دھندلائی

کیوں جا رہی ہیں۔ وہ...... وہ...... بس ایک ہیولیٰ سا لگ رہے ہیں۔ ارے کوئی مجھ پر جھکا۔ یا اللہ! مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کوئی رو رہا ہے۔ کوئی سسک رہا ہے۔ میں صرف سن سکتی ہوں۔ اے مالکِ دو جہاں۔ اگر موت ناگیز ہے تو میرے ہر احساس کو سلب کر لے۔ نہ سن سکوں۔ نہ محسوس کر سکوں۔ حیات و موت کے فرق کو مٹا دے۔ تو مجھے حوصلہ دے خدایا! میرے جیسا حرماں نصیب دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ کیا سوچا تھا۔ کیا ہو گیا'۔ کیا یہ میرے مرنے کے دن ہیں مولا۔ اُف اب مجھے گور کی تاریکیوں میں پناہ لینا ہوگا۔ کہاں آرزوؤں اور ارمانوں کا جگمگاتا شیش محل! کہاں یہ تاریک وادیاں۔ ایک مٹی کا گڑھا۔ اوپر منوں مٹی۔ نیچے کنکروں کا ریتیلا بستر۔ یا اللہ! کہیں کوئی جانور نہ کاٹ کھائے۔ یا خدا!! ان ساری چیزوں کے بدلے میں، مجھے جنت دینا۔ مجھے دنیا میں کچھ نہ ملا اور پھر یہ سہاگ رات بیت گئی۔ یوں کہ دولھا اس کے سرہانے بیٹھا رہا اور موت اس کی دلہن پر سایہ فگن رہی۔ عود و غیر کی جگہ کافور کی خوشبو سے فضا معطّر رہی۔ شاید موت کو اس رات کے انتظار کرنے کا حکم ملا تھا۔ رضوان احساس سے ماورئ پتھر کے بت کی طرح اس کے سرہانے بیٹھا رہا۔ دنیا کا بدنصیب ترین آدمی۔ دنیا میں جس کا کوئی نہ تھا۔ جس سے محبت کی وہ دنیا سے اٹھ گیا۔ جس کو پا کے سب کو بھول گیا تھا۔ وہ رخت سفر باندھ چکا ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں اجازت طلب کرتا ہے۔ کوئی امّی کو بلا دو۔ صبح ہو رہی ہے۔ نیا نویلا دولھا چپ چاپ دروازہ کھول کے نکل گیا۔

خالہ امی، چلئے، رخصت کی گھڑی آئی۔ اب دیر نہ کیجئے۔ میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ ڈولا سجایئے اور جب بڑی اماں کمرے میں آئیں تو رخصتی ہو چکی تھی۔

پی کے گھر آج پیاری دلہنیا چلی

اور پھر انھوں نے مٹھی میں کس کے جکڑنا چاہا۔ کس کو؟ —— حیات کے لمحے کو۔ زندگی کی گھڑی کو —— لیکن مٹھی میں ہوا کے سوا کچھ بھی نہ تھا —— اور ہوا —— ہوا کا وجود کہاں ——!!!

☆☆☆

اگر کسی کے لہو کا لکھا ضائع ہو جائے تو دکھ ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اکثر محترمہ حسن جبیں شکیل سے کہتا رہا کہ اپنے افسانوں کو کتابی شکل دینے پر غور کیجئے۔ حامی تو انھوں نے کئی بار بھری لیکن وقت نے اجازت نہیں دی بلکہ نشہء ہنر نے اپنے اثر سے نکلنے نہ دیا۔

ان کا تخلیقی سفر کافی لمبا ہے۔ ایک ساتھ ان کے چار پانچ مجموعے شائع ہو سکتے ہیں۔ ایک کہنہ مشق ادیبہ کی پوٹلی میں اتنا کچھ تو ہو ہی سکتا ہے۔ دیکھئے، ابتدا ہو گئی ہے۔

جس تیزی سے آخور کی بھرتی، کتاب کے نام پر شائع ہو رہی ہے اس سے بھی محترمہ کا دل کڑوا ہوا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کے جو مال اچھا ہے، اسے الگ باندھ کر رکھ دیا جائے۔ کب تک!

جانے کتنے ادیبوں کی تحریریں خوشبو پھیلا کر بھی بے معنی ہو گئیں۔ اس کتاب کی اشاعت پر امید ہے کہ پرانے ذہنوں میں اجالوں کی تجدید ہو جائے، اور نئے پڑھنے والوں کو یہ پتا چلے کہ ان تک پہنچنے والی روایت کے خمِ کاکل کی آرائش میں صرف وہ لوگ نہیں ہیں جو پلے کارڈ اٹھائے ہوئے ہیں۔

قنبر علی

حسن جبیں شکیل کی کہانیاں

ایک تجزیہ............ معین شاہد

.... حسن جبیں شکیل کی کہانیوں کا ہم تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی کہانیوں میں محبت کی ناکامی، ایک خلش ناتمام جو کنواری لڑکیوں کا سپنا بن گئی ہے، شادی بیاہ، لین دین، خلوص و پیار، عورت کا انتقامی جذبہ سب کچھ ملتا ہے۔

............افسانہ کا قدیم نظریہ ہے کہ اس کے آخری میں اچانک کوئی غیر متوقع حادثہ، کوئی انہونی سی بات ہو۔

حسن جبیں نے اپنی کہانی میں اسی نظریہ کی تقلید کی ہے............

حسن جبیں شکیل بھاگلپوری میں ایک اچھے افسانہ نگار بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔

.... حسن جبیں شکیل کا اگر افسانوی مزاج بن گیا اور انہیں ایک مناسب ماحول اور فضا میسر آگئی جہاں وہ اپنے خیالات اور احساسات کے تانے بانے جوڑ سکیں تو وہ اردو ادب کو اچھی کہانیاں دے سکتی ہیں۔

(ماخوذ: بھاگلپور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر سہیل گیا۔ معین شاہد: سنہ ۱۹۶۹ صفحہ ۴۹۳)

Saima Publication

Printed : Saima Publication, Dariyapur, Ahmad Market, Patna-4